

(افغان)

چهارہاں

احمد ندیم قاسمی



چوپال

(افانے)

احمد ندیم قاسمی

خالد!

تم نے اپنے سحر انگیز خطوط کے ذریعے میری سوچوں پر بہت بڑا اثر ڈالا ہے۔ ان خطوط کی روح سے میرے افسانے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ تم ان میں گوئیختے سمندروں کے مختارب پانیوں کے مظراں دیکھ سکو گے۔ اندھیرے گھنے جنگلوں میں درندوں کی بھیاںک دھاڑیں نہ سن سکو گے مگر ان میں ایک ورد مندا انسان سوچتا ہوا ضرور محسوس کرلو گے۔

تم شاید اپنے خطوط کے موضوعات بھول گئے ہو گے۔ شدت احساس میں انسان کا قلم غیر ارادی طور پر چلتا ہے۔ میں تمہارے خطوط کے چند اقباسات نقل کرتا ہوں۔ اس طرح تمہارے دل میں میرے بیشتر افسانوں کا حزینہ عرض نہیں کھلکھلے گا۔ اور ساتھ ہی تم دیکھو گے کہ تم نے میرے احساسات کی تشكیل میں بڑا حصہ لیا ہے۔

”ندیم، تم خوش کیوں نہیں رہتے؟“ یہاں ہمیشہ کے لیے تھوڑا رہنا ہے۔ چار دن ہیں اور وہ ہنستے ہنستے کیوں نہیں گزارے؟ کچھ لکھنا شروع کر دو۔ افسانے لکھا کرو۔ اس طرح تمہارا دل بہلا رہے گا۔

خشک پہاڑوں اور تاریک مرغبوں سے گزرتے ہوئے ہم پشاور پہنچے۔ ہمارے میزبان کا مکان پرانے بغداد کی محل سرا کی طرح ہے۔ اس کے پاس چند کھنڈر اور کھنڈروں سے پرے کوہ سلیمان کی اوپنی اوپنی خذ منڈ چوٹیاں گھرے گھرے بادل اور ان کی اوٹ میں عروں خورشید!

یہاں (بہاولپور میں) ایک مشاعرہ ہوا جس میں کئی گلا پھاڑ چاڑ کر پڑھنے والے تلامیڈ الرحمن تشریف لائے تھے۔ میں تو اس دن دریا پر تھا۔ اف! ندیم، عجیب نظر اتحا۔ سورج بادلوں کے سیاہ گھزوں میں چمکتا ہوا۔ بزرے سے ڈھکے ہوئے نیچے کنارے۔ ریتیلی ڈھلوانیں اور ہمارے سروں پر چینتی ہوئی مرغابیاں۔ میں کشتنی میں ناچنے لگا!

ندیم، خانہ بدھی اور سفر کا جادو میری رُگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ میں زندگی میں کٹکش پیغم کا تمنی ہوں! ندیم، میں نے محسوس کیا ہے کہ اس ملک میں صرف مصنف ہونا کوئی اچھی بات نہیں سمجھی جاتی۔ غالباً حیات جیل کا خون کر دیتی

کوئی ناول شروع کرو۔ لیکن آر۔ ایل اسٹینوں کی تصنیفات کو سامنے رکھ کر۔ شر را اور تیر تھر رام کی فضول اور طویل منظر کشی سے حتیٰ ا渥ع پر بیز کرو۔ ادب زندگی کا آئینہ ہونا چاہیے۔ مگر زندگی تنخ ہے اور اس میں کچھ ریگنی بھی چاہیے! کوئین کی گولی پر شکر چڑھاوی جائے تو اسے بچے بھی لگل جاتے ہیں۔

ہم نے اس تھوڑے عرصے میں محبت و خلوص کے کتنے مدارج طے کیے۔ ہم دونوں نہیں بتا سکتے۔ آگے کیا ہو گا؟ ہم زندہ رہیں گے اور دیکھیں گے۔

جس وقت تمہارا خطاط ملا، میں اسی۔ بی اسٹوو کے غمناک ناول۔ ”انکل نامز کپین“ میں گم ہوا بیٹھا تھا۔ یا ایک بہت دردناک رومان ہے۔ انسان اسے پڑھ کر بے اختیار رہ نے لگتا ہے۔ پڑھ کر تمہاری طرف بھیج دوں گا۔

کہانیاں لکھتا ہوں اور پھاڑ دیتا ہوں۔ پلاٹ ذہن میں آتے ہیں اور جانے کہ ہر گم ہو جاتے ہیں۔ میں تو اس بے خانماں ملاح کی طرح ہوں جو ایک دیر ان چنانی جزیرے پر اپنے چہاز کے نوٹے ہوئے تختے جھاڑیوں میں پہنے ہوئے دیکھا رہتا ہے اور روتا رہتا ہے!

اپنا ناول ”بھیڑیا“، ختم کر لیا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کے مصنف ”ابو قلم حضرت محمد خالد اختر صاحب ڈیگوی ٹم گجراتی“، بھی تقریباً تقریباً ختم ہو چکے ہیں!

کاش! میں ایک تیرتی کی طرح آزاد ہوتا۔ درود سر بزر وادیوں میں میری ایک جھونپڑی ہوتی جہاں طوفانی راتوں کو میں ایک غمٹا تھے چراغ کی روشنی میں دل سے نکلے ہوئے جذبات صفحہ قرطاس پر بکھیرتا رہتا

میرے ناول کو دیکھ کر آپ کیا کریں گے؟ ایک سترہ سالہ لڑکے کا چھوٹا سا دماغ آپ ایسے صاحب قلم کے لیے کوئی نئی چیز پیش نہ کر سکے گا۔ بی اے کا امتحان سامنے ہے۔ کئی دفعہ خیال آیا کہ دور بھاگ جاؤں۔ تنخ کے بھاؤ پر کشتی چلاتا جاؤں اور بیکار اس مندر میں داخل ہو جاؤں۔ کیونکہ میں کھلی ہوا، چھکلے ہوئے تاروں اور نیکیں پھواروں کو بہت پسند کرتا ہوں۔

مجھے یقین ہے کہ ایک انسان میں باعث روپوں میں اچھا خاصاً گزارہ کر سکتا ہے اور اس حالت میں جبکہ ہمارے ملک کے نیگے دھڑنگے بے گھر باشندوں کو اپنابدن ڈھانکنے کے لیے کپڑا اور رہنے کے لیے جھونپڑا میسر نہیں اور جن میں بہتوں کو دو وقت کی روٹی بھی حاصل نہیں ہوتی، بلند ملازمتوں کی خواہش کرنا بھی گناہ ہے۔ جب میں ان فاقہ زدوں، مر جھائے ہوئے کمزور لوگوں کو دیکھتا ہوں تو

اور دوستوں کے ساتھ دوش بدوش کھڑے ہو کر کام کروں اور میں یہ کروں گا۔ انشاء اللہ!

یہ بہشت ہے!

معنوں ہے۔

بے گناہ

سونے والے سو گنے مگر کچھ دلوں کو نیند کیسے آئے۔ رحمان دیر تک جا گتارہا اور اپنی قسمت کی تھی وہی پر مسکرا تارہا مگر اس کی آنکھوں میں آنسو بھی تھے۔ آنسوؤں سے بھیگی ہوئی مسکراہیں عجیب مگر دردناک ہوتی ہیں۔ اس نے کروٹیں بد لیں۔ آنکھوں پر پٹی بھی باندھ لی۔ اپنی پھٹی چادر بھی اوڑھ لی۔ پاس ہی ایک بوڑھی میں چینخے والے مینڈک کی کرخت آواز سے بھی لمحہ بھر کے لیے بے خبر ہو گیا مگر اسے نیند نہ آئی۔ دل کی وہڑکن تیز ہوتی گئی ماتھا گرم ہوتا گیا اور زندگی رفتہ رفتہ اس کے لیے ایک ناقابل برداشت جس کی صورت اختیار کرتی گئی۔

جس دن سے اس کی ماں نے دم توڑا تھا وہ کائنات کی ہر چیز سے نفرت کرنے لگا تھا۔ خاموشی اس کی زندگی تھی۔ اسے نہ احباب کی ضرورت تھی نہ عزیزوں کی۔ اس کی جوان آنکھوں میں ایک خلا ساتھا۔ اس کی ماں مر چکی تھی اور اب اس کا اس دنیا میں کوئی نہ تھا۔ وہ دن بھر بھل چلا تھا اور شام واپسی پر اسے اپنی بوڑھی ماں کی زبان سے شہد سے کہیں میٹھے الفاظ سننے کی امید ہوتی تھی مگر اب اب اسے وہ کھلا دالا ان اور سرخ مٹی سے تھوپا ہوا بھدا مکان کا منے کو دوڑتے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ انھ کر بیلوں کے گلے پر چھری پھیر دے، بکریوں کی گردیں مروڑ دے، کواڑ توڑ دے، سامان جلاڑا لے، کپڑے پھاڑ کر گاؤں سے باہر کل جائے اور کسی بلندی سے گر کر اپنی رُخی روچ کو ان آنکھوں سے ہمیشہ کے لیے رہائی دلا دے مگر مرتے وقت ماں نے اسے کہا تھا۔ ”رحمان بیٹا! میرے بعد جینا۔ تم جینے کے قابل ہو۔ اس عمر میں آنسو تھہاری آنکھوں کو زیب نہیں دیتے۔ مرنے کا خیال تک نہ کرنا۔ موت بوڑھوں کو سمجھتی ہے، جوانوں کو نہیں۔“

آج اگر اس کا بس چلتا توموت کا کیجھ نوچ کر اسے چبا جاتا۔ اس کے تاریک پیرا ہن کی دھیجاں آگ میں جھونک دیتا۔ اس کے سوکھے ہوئے لبے اور خوفناک ہاتھوں کو اپنے مضبوط پاؤں سے روندہ اتا مگر وہ ایک بیکس کسان تھا۔ ایک مغلس دہقان۔ ایک بے یار و مددگار انسان۔

صحیح ہوئی۔ گاؤں کا ذیلدار اللہ و تاریخ رحمان کے دروازے پر موجود تھا۔

”رحموں اور رحموں!“ اس نے کڑکتے ہوئے دروازہ کھلکھلایا۔ ”بھی حضور آیا۔“ رحمان نے تیزی سے آنسو پوچھتے ہوئے کہا۔

اس نے دوڑ کر دروازہ کھولا۔ اللہ تا مونچھوں کو بل دیتا ہوا اندر داخل ہوا اور بولا۔ ”کئی بار تم سے کہہ چکا ہوں کہ زمین کالگان مطالے پر ادا کر دینا چاہیے۔ مگر تم ہو کہ مکان کے اندر چھپ کر مجھ سے بچنے کی کوشش کرتے ہو۔ میں تم جیسے بھکاریوں کے کان کھینچ لیا کرتا ہوں۔ پانچ روپے ابھی پیدا کرو ورنہ میں گاؤں کے سارے چوکیداروں کو بلوا کر تمہارا بھر کس نکلوادوں گا۔“

”جی میں کوشش کر رہا ہوں۔ آپ جانتے ہیں؟ میں مقررہ دنوں کے اندر ہی معاملہ صاف کر دیتا ہوں۔ اس قدر سخت الفاظ تو اسے سنانے چاہیں جو آخری وقت تک نالاتا ہی چلا جائے۔“

”کواس کرتا ہے؟ مجھے آنکھیں دکھاتا ہے؟ قسم خدا کی پاٹھ میں لاٹھی ہوتی تو سر توڑ دیتا۔ کتوں کی طرح گھور گھور کر دیکھ کیا رہا ہے؟“

رحمان کے آنسو خشک ہو گئے، لکیجہ کا نپنے لگا، بازوؤں کی رگیں ابھر آئیں، ماں کا غم بھول گیا اور تن کر بولا۔ ”ملک صاحب! میں اس قسم کے الفاظ سننے کا عادی نہیں ہوں۔ بہتر ہے یہاں سے تشریف لے جائے ورنہ۔“

”ورنہ؟..... ورنہ کیا؟“ ذیلدار کا ہاتھ مونچھ کی نوک سے علیحدہ ہو گیا اور ابر و آنکھوں پر جھک آئے۔

”ورنہ میرے بازوؤں میں بھی جان ہے۔“

”اچھا“ ذیلدار نے آگے بڑھ کر اپنی پوری طاقت سے رحمان کے منہ پر ایک تھپڑ ریڈ کیا تو وہ شیر کی طرح ذیلدار پر جھپٹا اور آن کی آن میں اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ گھنسوں سے اس کی بڈیاں ڈھیلی کر دیں اور بھی بھر گیا تو اسے کان سے پکڑ کر باہر نکال دیا۔ اسے کسی قسم کے پشیمانی کے احساس نہ تھا۔ اس نے اپنی دانست میں ذیلدار کو ایک سبق سکھایا تھا اور وہ مطمئن تھا کہ اس کی غیرت نے ذیلدار کے سامنے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

گاؤں میں یہ واقعہ کیسے مشہور ہوتا۔ بے عزتی کے خوف سے ذیلدار کے منہ سے اف تک نہ لگی۔ اگر کوئی چہرے کی رنگت کے تغیر کا باعث دریافت کرتا تو وہ یہ کہہ کر نال دیتا کہ ایک زہریلے کیزے نے تمام چہرے کا ستیاناں کر دیا ہے۔

اسی دن شام کو رحمان آنا گوندھ رہا تھا۔ چڑیوں کے لاتھ داغوں ”شی“ کی آواز سے اس کے مکان پر سے گزر جاتے تھے۔ چمگا دڑیں بیری کی سوکھی ہوئی ٹہنیوں سے نکلا کر پھر پھر اتنی تھیں اور پھر ہوا میں تیرنے لگتی تھیں؛ بیل جگالی کر رہے تھے ایک بکری اپنے ننھے سے پچ کے ماتھے پر منہ رکھ کھڑی تھی۔

لیکا یک گاؤں میں ایک شورا تھا اور آن کی آن میں رحمان کے قریب ہوتا گیا وہ دوڑ کر مکان پر چڑھ گیا۔ دور جنوب مشرقی

کنارے پر ایک زبردست چک تھی۔ آگ اور دھواں..... اس کے دل پر ہتھوڑا سا پڑا۔ مانچے سے پسند پوچھا اور مکان سے اتر کر دوڑتا ہوا گاؤں کے چوپال پر جا پہنچا۔

”وہ کیسی آگ ہے احمد خان؟“ اس نے اپنے ایک دوست سے دریافت کیا جو اس کی طرف دوڑا آ رہا تھا۔

”تمہیں ابھی تک معلوم نہیں؟“

”نہیں۔“

”تمہارا کھلیان جل گیا۔“

رحمن سر سے پاؤں تک کا نبض اٹھا۔ آنکھوں میں آنسو بیل آئے۔ اس کی زبان سے ایک لفظ نہ لکلا۔

”بہت افسوس ہے رحمان بھائی، مجھے تمہارے ساتھ بہت ہمدردی ہے۔“

”ہونی چاہیے میرے دوست۔ میں اب ایک مفلس اور قلاش انسان ہوں بے یار و مددگار۔“

”کیوں؟ جب تک میں زندہ ہوں تمہیں اس قسم کی شکایت کرنا مناسب نہیں۔“

ای کے بعد احمد خان نے رحمان کا ہاتھ پکڑا اور گاؤں سے باہر ایک کھنڈر کی طرف لے چلا۔ ابھی تک کھلیان پر جلے ہوئے غل کی چک باتی تھی۔ رحمان کا خون آنے والے سال کے خیال سے خشک ہوا جا رہا تھا۔ ان کے پاؤں کی چاپ سے جھینگروں کی آوازیں بند ہو گئیں۔ سوکھے ہوئے پتے ٹوٹتے تھے اور فضا میں ایک خوفناک مضمہ گونج کا نبض جاتی تھی۔ گاؤں میں ابھی تک شور چاہا ہوا تھا۔ رحمان کی آنکھوں سے اب آنسوؤں کی جگہ شعلے نکل رہے تھے۔ وہ چلتے چلتے اپنے ہونٹ اپنے دانتوں سے کاٹ لیتا تھا۔ ایک پتھر پر بیٹھتے ہوئے احمد خان نے کہا۔ ”بھائی، جو ہونا تھا ہو چکا، اب سوچنا یہ ہے کہ یہ ہے کس شیطان کا کام، تم کسی کے دشمن نہیں، گاؤں کا بچہ، بچہ تمہارا دوست ہے۔ پھر یہ کرتوت کس نے کی؟“

”احمد خان، سچ کہوں، یہ ذیلدار میرے آنکھوں میں کھٹک رہا ہے۔ اس نے.....“

یکا یک رحمان رک گیا۔ احمد خان کی حرکات پر اسے حیرت ہونے لگی۔ رحمان کی باتوں سے بے خبر ہو کر وہ داسیں باسیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا اور پھر بار بار اپنا ہاتھ اپنی جیب تک لے جاتا تھا۔ رحمان نے متوجہ ہو کر پوچھا۔ ”تمہاری جیب میں کیا ہے احمد خان؟“

احمد خان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ہاتھوں میں رعشہ آ گیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر لڑکھڑا کر گر گیا۔ رحمان نے جھپٹ کر اس کی

جیب پر ہاتھ مارا..... ایک تھا ساپسول..... احمد خان کی گلشن کے باوجود اس نے پسول اس کی جیب سے باہر نکال لیا اور کڑک کر پوچھا۔ ”یہ کیا معاملہ ہے احمد خان؟“

”معاف کرنار رحمان خاں ذیلدار نے مجبور کیا تھا کہ تمہیں قتل کر دوں مگر میرا دل بینھ گیا۔ مجھے بخش دو۔ مجھے معاف کر دو بھائی، میں نے غلطی کی۔ میں بھٹک گیا تھا میرے دوست۔“

”خدا تمہیں غارت کرے بد بخت انسان، مجھے تم سے یہ امید نہ تھی۔ تم میرے کتنے عزیز دوست تھے!“

”میری قسمت!“ احمد خان نے اپنے ماٹھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ اس کے ان دو الفاظ میں بھی لصون ساختا۔

رحمان پسول لیے ہوئے سیدھا گھر آیا۔ دروازہ بند کر دیا، پسول سرہانے رکھا اور کھانا کھائے بغیر ماں کی یاد کھلیاں کی تباہی ذیلدار کے ظلم اور احمد خان کی غداری پر غور کرتا ہوا سو گیا۔

آدمی رات تھی کہ اس کے دروازے پر کسی نے دستک دی۔ وہ چونک کراٹھا اور آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا ”کون ہے؟“
”پولیس۔ دروازہ کھولو۔“

”پولیس!“ اس نے ولی زبان میں کہا اور پسول کو دوڑ کر بھوے میں چھپا دیا۔ دروازہ کھولا۔ گاؤں کا چوکیدار ارشع لی کھڑا تھا۔
پائی چھپاہی اس کے پیچھے تھے اور ان کے قریب ذیلدار کھڑا مسکرا ہاتھا۔

سپاہی مکان کے اندر گھس گئے۔ ذیلدار چوکیدار اور ایک سپاہی نے رحمان کو حرast میں لے لیا۔ رحمان خاموش رہا۔ اس نے کوئی حرکت نہ کی۔ وہ بھونچ کا سارہ گیا تھا۔ سپاہی مٹی کے برتوں کو اٹھا کر ان میں جھانکتے اور پھر زمین پر دے مارتے۔ اس کے بوسیدہ کپڑوں سے اپنے بھدے بوٹ پوچھتے چار پائیوں کو الاتتے جاتے۔ ایک نے تو رحمان کے گڑ کا برتن توڑ کر سب کچھ اپنی جیبوں میں ڈال لیا۔ اس چار دیواری میں ایک قیامتی پیچی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پولیس کے یہ سپاہی بھوکی گدھیں ہیں جو ایک گلی سڑی لاش پر جھپٹ جھپٹ کر اس کی ہڈیوں کا گودا تک نوچ رہی ہیں۔ رحمان خون کے گھونٹ پی رہا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ یہ انصاف کے ٹھیکیدار اس کی محدود پوچھی کوتباہ کے جارہے ہیں مگر اس کی زبان سے اف تک نہ لکی۔ وہ سب کچھ خاموشی سے دیکھتا رہا۔ ذیلدار مسکرا تا رہا اور چوکیدار کا نیتا رہا۔ جب سب مکان کی تلاشی لے لی گئی اور کسی قسم کی خطرناک اور ناجائز چیز برآمدہ ہوئی تو تمام سپاہی رحمان کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے بڑھ کر رحمان کی پیٹھ پر ایک بید مارا۔ رحمان کا اپ اٹھا۔ اس کی کنپیوں میں خون الٹنے لگا۔ ہونٹ جلنے لگے۔

”کہاں ہے تمہارا پستول؟“ بیدوالے نے ڈپٹ کر کہا جو ضع قطع سے حوالدار معلوم ہوتا تھا۔

”میرا کوئی پستول نہیں میں غریب کسان ہوں، کسی کا دشمن نہیں، میرا کام ہل چلاتا ہے، پستول چلانا نہیں،“
”لیکن تمہارے پاس ایک پستول ہے ضرور۔“

”نہیں جناب، کوئی نہیں۔“

”بکواس کرتا ہے کم بخت بتادے ورنہ پچھتا گا۔“

ابھی رحمان جواب بھی دینے نہ پایا تھا کہ ذیلدار نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”مگر اس بھوسے کے ڈھیر کو بھی دیکھا؟“
تمام سپاہی دوڑ کر بھوسے کے ڈھیر پر چڑھ گئے۔ پستول مل گیا۔ دوسپاہیوں نے رحمان کو تھکری لگائی اور اسے گاؤں کے چوپال پر لے گئے۔

صحیح چوپال پر سب گاؤں والے اکٹھے ہو گئے۔ عورتیں چھتوں پر کھڑی رو رہی تھیں۔ سینکڑوں آنچل بار بار آنکھوں تک اٹھ جاتے تھے۔ چوپال پر گاؤں والوں کی چمیگوئیوں سے ایک عجیب سی دبی دبی سرسرابہت کی آواز آتی تھی۔ رحمان کو تھکری لگی ہوئی تھی اور وہ سر جھکائے اپنی پھٹی ہوئی جوتی کو دیکھ رہا تھا۔ ذیلدار اپناب سے اچھا بالا پہنے مسکرا رہا تھا۔ سپاہی حقے کے کش لگا رہے تھے۔ اتنے میں حوالدار اٹھا اور بولا۔ ”اچھا، رحموں! انھوں کاں کو تھکری کی ہوا کھانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ کم بخت! پستول تو تم نے بہت اچھا حاصل کر لیا تھا کہیں سے، کس سے لیا تھا؟“ یہ کہہ کر حوالدار نے ہاتھی دانت کے دستے والا پستول ہوا میں اچھالا۔ رحمان نے سب لوگوں پر نظر ڈالی۔ احمد خاں ایک کونے میں دبکا بیٹھا تھا۔ رحمان کی سرخ نم آلوہ آنکھیں دیکھ کر کانپ اٹھا۔ رحمان کے دل میں پرانی دوستی کی یاد کھٹک گئی اور پھر احمد خاں ایسا بزدل کم طرف انسان! وہ کمزور کو برپا دکر کے خود کیا خوش رہے گا۔ سر جھکا لیا۔

”رحموں!“ حوالدار نے پھر پوچھا۔ ”بتادو شاید تم اس طرح رہا کر دیئے جاؤ۔“

”تھانیدار صاحب!“ چھت پر سے کسی عورت کی آواز آئی۔ تمام نگاہیں اس طرف اٹھ گئیں۔ ذیلدار کی اکلوتی بیٹی سب عورتوں سے آگے بڑھ کر کھڑی تھی۔ اس کے سیاہ رنگ کے دو پچے میں اس کے دکھتے ہوئے رخاریوں چمک رہے تھے جیسے ساون کی بدیوں میں چاند۔ رحمان نے بھی اس طرف دیکھا۔ ماں کی موت کا مارا، مفلس، مسکن دست، رحموں تھکریوں کی فولادی گرفت سے بے پرواہ کر مسکرا یا۔ لڑکی بھی مسکراتی، گاؤں کے چوپال میں پانچ چھ سو آنکھوں کے گھورتے ہوئے دائرے میں پولیس کے سامنے! رحمان نے محسوں کیا کہ اس نے تھکریوں کی جگہ ہلکے ہلکے پھواں کا ہار پکن رکھا ہے۔ ماں کی موت تقدیر کی بات ہے۔ کھلیاں کا

چلنا کوئی نرالا حادثہ نہیں۔ ذیلدار کے حملے۔ وہ تھا ہی اس قسم کا کمینہ انسان۔ احمد خان کی غداری! چودھویں صدی کی دوستیاں جب آب سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ اور اب اس لڑکی کی گھری گھری سیاہ آنکھیں، پھول جیسے رخسار، شیش جیسا ماتھا، بیضوی چہرہ اور گول سفید ٹھوڑی۔ پھر اس کی مردانہ جرات پولیس والوں کے سامنے اکڑ کر کھڑی تھی۔
 ”کیوں کیا یات ہے لڑکی؟ حوالدار نے لڑکی کو گھوکر کر دیکھا اور گھبرا کر مانتھے کا پسند پوچھ لیا۔
 ”میں پستول دیکھ سکتی ہوں؟“
 ”کیوں؟“

”شاید میں بتا سکوں ملزم نے یہ کہاں سے حاصل کیا ہے؟“

کیوں؟

”میں پستول دیکھ سکتی ہوں؟“

”کیوں؟“

”شاید میں بتا سکوں ملزم نے یہ کہاں سے حاصل کیا ہے؟“

ذیلدار تھر انہما۔ اس کے پانچ سو سے اس کی تیمیں چھڑی گر پڑی اور زبان لو بے کی طرح اکٹھ گئی۔ حوالدار نے بڑھ کر پستول لڑکی کو

دے دما۔ اس نے غور سے دیکھا۔ ایک بار آنکھوں کو ملا اور پھر سہ جھکائے ہوئے ہوئی۔ ”تو میرے ابا جی کا پستول ہے۔“

ہر طرف ایک ہولناک سکوت جھاگھا۔ نمودار کا سر چکرا گھا۔ نمودار نے مذکور اس کا طرف دیکھا اور بوجھا۔ ”کبھاں ملک چیز؟“

آب کی صاحبزادی سچ کہتی ہے؟“

"جموٹ بچت سے نا خلف رہا، گتا رہ۔" اور اس کے ہونٹ س الفاظ کہتے ہوئے بھی سنے گئے۔ "حرام زادہ۔"

وَإِذَا أَتَاهُمْ حِلَالَهُمْ كَانُوا كَمْ مِنْ يَوْمٍ دُونَهُ رَأَيُوا إِذَا غَيَّرُوا آنَّهُ لَمْ يُغَيِّرْهُ كَمْ كَانَتْ رِيحُ الْأَنْبَاطِ

کھلے تھے ریگنا جنہاں کے نظر میں اس کے "تم" کے حاشیے - اصل کے تباہ اتنا لاملا جس کے آنکھیں میں

ح. اتنا چہارہ کے عتیق نے گھنے نام کا خواہ گھنے بھنے کا تھا۔

کے تھے کے مجھے کامنے کے

”اچھار جمیں تمہارا کیا بیان سے؟“ حوالدار نے یوں جھپٹا۔

"حضور" رحمان نے حیثیت سر اک طاڑائش نگاہ ڈالتے ہوئے اور سننے کو دھاتے ہوئے کہا۔ اسے خوف تھا کہ کہیں لوگ اس کے

دایکیوک داکن میکر، "حضور حجی را تداور نمی‌داک" برای دیدگار انسان‌ها، مردم کوئی رشت داشتند و این دست

مکالمہ حکاکی میں اس بات کا ذکر ہے کہ کالا آنکھیں بڑیں، اور تاریخ گفتگو میں وہ کوئی نہیں۔

ہوئی رپورٹ ہے۔ مل جھٹکو اس سے جگا ہے۔ ایسا دل بھوں۔ اس ملے اس حاجی کے نزدیک کوکا کالا کچھ اگذا ہے۔

”ذیلدار صاحب تیرے خلاف کیوں ہیں؟“

”خدا واسطے کا بیر ہے جناب۔ مجھے غریب کا کھلیان بھی کل شام انہی نے جلا یا اور مجھے کنگال بنایا۔ مجھے قتل کرنے کی تجویز بھی کی۔ ان کے کرایہ کے مٹو سے میں نے پستول چھین لیا۔ اندھیرے میں میں اسے نہ پہچان سکا۔ وہ تو نج اٹکا لیکن یہ پستول اب میری گرفتاری کا سبب بن رہا ہے۔“

”جب یہ بات تھی تو تم نے پستول چھپانے کی کوشش کیوں کی؟“

”میں ڈر گیا تھا حضور۔ میں نے کبھی پولیس کو اپنے گھر پر نہیں دیکھا۔ مجھے سرخ گڈڑی سے خوف آتا ہے حوالدار جی۔“

”بہانے تراشتا ہے بد معاش“

”لیکن حضور اس لڑکی کی بات تو سچی ہے نا! وہ میری تو کچھ نہیں لگتی، ذیلدار جی کی اکلوتی لڑکی ہے۔“

”ہاں وہ حق کہتی ہے، انہی کا پستول ہے لیکن تو نے چوری کر کے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔“

رحمان کو محسوس ہوا کہ آسمان تحلیل ہو کر اس کے سر پر چٹانوں کی شکل میں گر رہا ہے۔ اس کی آنکھوں تک اندھیرا چھا گیا۔ چوپال سے اترتے وقت اسے زمین کی جگہ کھولتے ہوئے خون کا ایک مضطرب سمندر نظر آیا جس میں تمام کائنات آہستہ آہستہ ڈوبی جا رہی تھی۔ ہاں چھت پر ایک چک سی محسوس ہوئی اور سہم گیا۔ نئے پھوٹ کے بلکہ کی آوازیں نہیں۔ بوڑھوں کی تھکیاں بھی ایک صدائے بازگشت کی طرح اس کے کانوں تک آئیں اور پھر اس نے حوالات کا بھاری دروازہ بند ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ گلے بد بودار فرش پر بیٹھ گیا اور سر کوز انوں پر رکھ کر سوچوں میں ڈوب گیا۔

دو سال قید بامشقت کی سزا نادی گئی اور اسے لاہور سٹرل جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ پہلے پہل تو اسے جیل کی تنگ و تاریک کوٹھریاں دور سے منہ پھاڑ کر جھپٹنے والی بلا کم معلوم ہوتی تھیں مگر کہتے ہیں کہ انسان دوزخ سے بھی آہستہ آہستہ ماںوں ہو جائے گا۔ سو وہ جیل کی ہر چیز سے انس کرنے لگا۔ چکیوں کی مسلسل گھر گھر میں اسے اک نو خیز لڑکی کی کانپتی ہوئی رسلی آواز سنائی دیتی تھی۔ ہر کوٹھری کی چھت سے اسے بڑی محبت تھی۔ ایک کھرد رے کمبل سے اپنا مضبوط جسم پیٹ کروہ تمام رات رخت کی صبح کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ اکثر اس کی ماں اسے بہلاتی ہوئی نظر آتی تھی مگر اس کا آوارہ تصور اپنی ماں اپنے گاؤں اور اپنے گھر سے اڑ کر پھر اسی دو شیزہ کی آنکھوں پر منتدا نے لگتا تھا۔ وہ اس امید پر جی رہا تھا کہ رہا ہونے پر گاؤں میں جا کر پہلے اپنی ”جو اہر“ کو دیکھنے اور پھر اپنے سناں گھر کی خبر لے۔

ڈیڑھ سال نہایت آرام سے گزر گیا۔ جیل کے کسی اپنکار نے اسے کبھی برا بھلانہ کہا۔ وہ وقت پر اپنا کام کر کے موئی خی کی تیزی پر دراز ہو جاتا اور صحیح پھر اپنے فرض میں ہمہ تن مشغول! اچانک ایک دن اس کے بند بند میں درد ہونے لگا۔ اس کا جسم تو نہ لگا اور اس نے آدھا کام ختم کر کے اپنے آپ کو فرش پر گردیا۔ شام کو ایک سپاہی آیا تو دیکھا کہ رحمان فرش پر پڑا ازور زور سے کراہ رہا ہے۔ بعض خطرناک حد تک تیز تھی، ماتھا جل رہا تھا، ہونٹ دکھ رہے تھے، آنکھیں انگارہ بن گئی تھیں۔ اسے جھٹ ہستال پہنچا دیا گیا۔ مگر مرض میں کمی واقع نہ ہوئی۔ ایک ہفتے کے اندر اس کی وجہت میں کمی آ گئی اور اس کا سذوں جسم سوکھ کر کاٹا ہو گیا، سر سے بال گر گئے آنکھیں اندر دھنس گئیں، ہونٹ خشک ہو کر پھٹ گئے، زبان سفید ہو گئی، اٹھنے بیٹھنے تک کی سکت نہ رہی۔ ڈاکٹر نے اس کی رہائی کی سفارش کی۔ حکومت نے رحم کی درخواست قبول کر لی اور گاؤں میں ذیلدار کو خبر بھیج دی کہ ”رحمان رہا ہو کر آ رہا ہے مگر سخت یمار ہے۔ آشیش سے اس کی چار پائی اٹھوانے کا انتظام کرو۔“

ظالم کے دل پر ایک چوتھی پڑی۔ وہ غریب نوجوان اس کے مردوں غصے کا شکار ہو کر اب موت کا شکار ہونے والا تھا۔ جھٹ کچھ آدمی بلائے اور رحمان کو آشیش سے اٹھا کر گاؤں لے آیا۔ رحمان کا مکان گرچا تھا۔ گاؤں کے چوپال پر اس کی چار پائی رکھوادی گئی۔ گاؤں کے بچے جوان بوڑھے، عورتیں جو ق در جوق ایک نہ ختم ہونے والے سیلاں کی طرح چوپال پر امدا آئے۔ رحمان ایک مٹھل اور مردہ ہی مسکراہٹ سے سب کی مزاج پری کا جواب دتا گیا اور اپنے سوکھے ہوئے زرد ہاتھ سے مصافی کرتا گیا۔

جب تمام عورتیں اور مردوں چلے گئے تو سامنے سے جواہر آتی ہوئی نظر آئی۔ اس کا بے تحاشا دھڑکا ہوا نجیف دل ایک لمحے کے لیے قنم گیا۔ جواہر کی حسین اور جوان آنکھوں سے غم و اندوہ جھانک رہے تھے۔ رخسار سوکھ کر باسی پر ٹکن اور وقت سے پہلے توڑے ہوئے سیب کی طرح بے رونق تھے۔ وہ رحمان کے نزدیک آ کر جگلی، بے اختیار اس کی ترسی ہوئی آنکھوں سے دو آنسو ٹکے اور رحمان کی بیاسی آنکھوں میں جاگرے۔ رحمان نے آنکھیں بند کر لیں اور انہیں آنکھوں کے رستے وہ دو قسمی آنسو پی گیا۔ وہ اپنے آپ کو قوی دو حصوں آنسوؤں پر شمار کرنے کے لیے تیار بیٹھا ہے اور حقیقت میں شارکر چکا ہے۔

جوہر نے صرف یہ پوچھا۔ ”رحمان خاں یمار ہو گئے ہو؟ اچھے ہو جاؤ گے۔ مولا کریم کرم کرے گا۔ میں تمہاری دعا گو ہوں۔ تم جیتے رہو۔ جیتے رہو۔“ اس کی آواز بھر گئی اور وہ تیزی سے آچل سنجا لاتی ہوئی چلی گئی۔

رحمان شش در سارہ گیا۔ اس دن شام تک اس کے ہونٹ نہ بلے، آنکھیں نہ کھلیں، دل بدستور کمزور رفتار سے دھڑکتا رہا اور نبضیں اس طرح بکلی بکلی جنبش سے کامپتی رہیں۔

شام کو ذیلدار اس کے پاس آیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”رحمان خان مجھے معاف کر دو میں شرمند ہوں۔“

رحمان خان نے آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ کو معاف کرتا ہوں جتاب، مگر خدا کی معافی کا میں ذمہ دار نہیں۔“

ای ون آدمی رات کو رحمان نے دم توڑا۔ ادھر اس کی روح نے عرش کی جانب پر پھر پھرائے، ادھر جواہر کے گھر ٹھیٹھا تاہوا دیا بھک سے بھج گیا۔ رات کی رات یہ خبر گاؤں میں بھلی کی طرح دوڑ گئی۔ لوگوں کی چینوں میں ایک عورت کی دردناک آواز اس طرح بلند ہو رہی تھی، جیسے کونجوں کے قافلے میں اس کوچ کی چیخ کی چیخ جس کا محبوب کسی شکاری کے ہاتھوں زخمی ہو کر گرچکا ہو۔

رحمان کو دفنادیا گیا۔ اس کے مرنے کے ایک ہفتہ بعد اچانک ذیلدار کے بیلوں پر کسی عجیب بیماری کا حملہ ہوا اور تین یتل تو دو دن میں پھر کر مر گئے۔ تیرے دن اس کا خوب صورت گھوڑا ایک بلند چٹان سے پھلا، سنجھل نہ سکا اور انگڑا ہو گیا۔ ذیلدار کا نخا بچہ شام کو جھوٹے میں سوتے سوتے چینا اٹھا اور اچھل کر زمین پر آ رہا۔ نیچے لو ہے کا چولہا پڑا ہوا تھا، اس کا دماغ پھٹ گیا اور آدھ گھنٹے میں اس کا دم فکل گیا۔ چوتھے دن ذیلدار خود چار پائی پر دراز ہو گیا۔

جواہر یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی اور اسے معلوم تھا کہ یہ خدائی قهر ہے۔ بے گناہ کا خون خاموش نہیں رہتا۔ وہ دوڑتی ہوئی رحمان کی قبر پر گئی۔ وہ روزانہ اس کی قبر سے آ کر لپٹ جاتی تھی اور آنسوؤں سے قبر کا تعویز دھو جایا کرتی تھی مگر آج اس نے آتے ہی چینا شروع کر دیا۔ ”میرے رحمان۔ تم دنیا کے لیے مر چکے ہو مگر میرے لیے زندہ ہو۔ تم جانتے ہو باپ کتنا ہی ظالم کیوں نہ ہو مگر میں اس کی تباہی نہیں دیکھ سکتی۔ تمہارے غصے کا فرشتوں نے بدلہ لینا شروع کر دیا ہے۔ عنقریب میرا بھولا باپ مر جائے گا، پھر میں کہاں جاؤں گی رحمان؟ مجھ پر لوگ ظلم کریں گے۔ میرا کوئی نہ رہے گا۔ میرے باپ پر حرم کرو۔ اللہ میاں کے آگے اس کی سفارش کرو۔ اس کی جگہ مجھے اپنے پاس بلا لو رحمان! ہماری محبت کتنی نادار تھی؛ کتنی پیاسی، بھوکی، محروم! میں ابھی تک تمہاری محبت میں جل رہی ہوں رحمان جلتی رہوں گی۔ مجھے اپنے پاس بلا لو۔ میرے باپ پر حرم کرو محبوب میرے! تم نے تو اسے بخش دیا تھا رحمان پیارے!“

اور دوسرے دن ذیلدار کا بخار اتر گیا مگر جواہر کو جیسے آگ لگ گئی۔ شام ہوتے ہوئے اس کی زبان پھٹ گئی، گلا سوچ گیا۔ لوگوں نے کہا کہ قبرستان کے بھوٹ چٹ گئے ہیں۔ حکیم اور پیر بلاۓ گئے لیکن نسخہ گذرا تجویز ہونے سے پہلے جواہرنے خدا کے آگے جان دے دی!

گاؤں والیوں نے پیٹ پیٹ کر اپنے سینے لال کر لیے۔ بال نوج لے۔ دیواروں سے سر پھوڑ لیے۔ جواہر ایک ہر داعریز خاتون تھی۔ ذیلدار ایک دیوار سے پیٹھے لگائے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آسمان کی طرف نکتارہا۔ جواہر کو رحمان کے پاس ہی وفات دیا گیا۔ اب بھی جب پوچھئے دہقان کندھوں پر ہال دھرے یہاں سے گزرتے ہیں تو آنسوؤں سے لمبڑا آنکھوں سے ان دوسرا مدد کی ڈھیر یوں کو دیکھ کر اپنے ہاتھ اٹھاتے ہیں اور فاتح پڑھ کے آگے چل دیتے ہیں۔ دونوں کی قبروں سے دو جهاڑیاں اگ کر ایک دوسرے سے مل گئی ہیں اور اگر غور سے دیکھا جائے تو ان کی ٹھنڈیاں ایک دوسرے میں یوں پیوست ہو گئی ہیں جیسے یہ دونیں بلکہ ایک ہی جهاڑی ہے دوپہر کو بوز حا احمد خاں اکثر ان قبروں کے قریب کھانتا سنایا ہے اور کئی چروں ہوں نے دیکھا کہ وہ قبروں پر سر رکھ کر گھنٹوں روتا رہتا ہے۔

خنک اور خاموش شاموں کو ضعیف سفید ریش ذیلدار ان قبروں کے پاس آ کر اپنے مضھل ہاتھ اٹھاتا ہے۔ اسے محبوں ہوتا ہے کہ رحمان ابھی قبر پھاڑ کر اسے دبوچ لے گا۔ مگر کچھ نہیں ہوتا۔ دور کسی دھنسی ہوئی قبر میں کسی الوکی کرخت آواز کے سوا، قبرستان مردہ سکوت میں غرق ہوتا ہے۔ ہوا سر سراتی ہوئی اس جهاڑی سے گزرتی ہے اور اس کے سفید بالوں کو چھیڑتی آہستہ آہستہ پھیلتی ہوئی تارکیوں میں غائب ہو جاتی ہے!



دیہاتی ڈاکٹر

ایک عزیز کی علاالت کی وجہ سے مجھے اپنے علاقے کے مرکزی قبے میں جانا تھا۔ سرگاری خیراتی ہسپتال وہیں تھا۔ میں اپنی درمیانہ قد کی بزرگ گھوڑی دوڑائے جا رہا تھا۔ مکنی کے گھرے بزرگ گھیتوں میں ایک نگل سی گندنڈی دور بزرگ تاریکیوں میں گم ہو رہی تھی۔ بچکے ہوئے بلند پودے رکابوں کے ساتھ زور سے نکل رہے تھے اس لیے چھر چھر کی ایک مسلسل آواز سے تمام فضا گونج رہی تھی۔ کنوئیں روں راں کی راگینیوں سے اپنے آقاوں کا جی بہلار ہے تھے۔ خنی اور نو خیز لڑکیاں پودوں کے پاس بیٹھی کھرپا چلا رہی تھیں۔ کچھ ادھیز عمر کی عورتیں کھیتوں میں گھاس اکٹھی کر رہی تھیں۔ کہیں کہیں کوئی بچہ دھوپ میں کھیت کے کنارے انکو خاچوں چوں کر آسان کی بلندیوں کو گھوڑہ رہا تھا۔ درختوں کی شاخیں بخندی بخندی ہوا کے مامن جھونکوں سے بلکہ بلکہ ہمکو رے لے رہی تھیں۔ ایک کنوئیں پر حق کی محفل گرم دیکھ کر میں نے لگام کھینچی اور اتر کر حق کی جانب بڑھا۔

ایک بوڑھا اور دونوں جوان پتھروں پر ایڑیاں دھرے باری باری سرحدی حق کے کش لگا رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی تینوں اٹھے۔ نہایت ادب سے میرے ساتھ مصافی کیا۔ بوڑھے نے رسی طور پر نہایت آہنگی سے کہا ”آئے، خیر سے آنا ہوا؟“ پھر ایک جوان کو اشارہ کیا جس کے لمبے لمبے سیاہ پٹے اس کے لال لال رخساروں پر بکھر رہے تھے۔ وہ کھاث جھاڑ کر اٹھا لایا۔ حق تازہ کیا گیا۔ تمبا کو کو مسلکر ڈالا گیا۔ میں دو چار کش لگا کر اٹھا تو میری جیب میں ایک بوتل کا سردیکہ کر بوڑھا بولا۔

”ہسپتال جائیں گے آپ؟“

”ہاں چچا۔“

”خیریت تو ہے گھر میں؟“

”کچھ تکلیف ہے۔“

”اللہ فضل کرے“ ”ڈاڑھ“ کو جانتے ہیں آپ؟ یہ نیا ڈاڑھ؟“

”کوئی نیا آیا ہے کیا؟ میں تو نہیں جانتا۔“

”سن ہے بڑا خالم ہے وہ اور سن اکیادیکھا بھی ہے۔ بغیر پیسے کے وہ دوائی دیتا ہی نہیں۔“

”اچھا؟ ڈاکٹر تو شریف ہونا چاہیے۔“

”ہونا تو چاہیے ملک صاحب! مگر وہ تو سید ہے منہ بات تک نہیں کرتا۔ پرسوں بڑھیا کی کھانی زور پکڑ گئی تھی۔ میں بھاگا کا بھاگا دہاں پہنچا۔ مجھے کیا معلوم کہ پہلا ڈاکٹر بدلتا گیا ہے۔ میں نے سلام کیا تو جیسے اس نے سنائی نہیں۔ میں نے کاندھا بھالا یا تو مجھ پر بر س پڑا اور خدا جانے فرنگیوں کی زبان میں کیا واہی تباہی بک گیا۔ ٹکل دیکھو تو پہار کوئے کی طرح۔ میں بیٹھا رہا اور جب وہ میری طرف متوجہ ہوا تو میں نے بڑھیا کے حالات کھل کر بیان کرنا چاہے مگر ایک کھانی کا نام ہی لیا تھا کہ کھٹ سے ایک کاغذ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں تو چکر اگیا ملک جی! وہ کوئی اتنا اللہ کا پیارا تو تھا نہیں کہ اس کو پہلے ہی سے مریضہ کا حال معلوم ہوتا۔ پھر میں کرم پوڈر (کمپاؤنڈ) کے پاس گیا تو اس نے الگ خزرے شروع کر دیے۔ کوئی بھلا آدمی باہر بیٹھا تھا، مجھے الگ لے جا کر سمجھایا کہ اسے کچھ پیسے دو، تب دوائی ملے گی۔ آج کل ہسپتال پر حریصوں کا راج ہے۔“ میں نے چار دن ہوئے شہر میں دونی کی بیزی پیچی تھی اور ہی پیش کر کے روٹھے کو منایا۔ کیا بتاؤں ملک جی! خوشی سے اس کی باچھیں کھل گئیں۔ کوئی چار قطرے بوتل میں پکادیئے اور مجھے بازو سے پکڑ کر باہر برآمدے میں دھکیل دیا۔ یہ خیراتی ہسپتال ہے ملک صاحب! اور اگر خیراتی نہ ہوتے، پھر ہم غریب لوگ تو خاک چانٹے مر جاتے۔ اور ان چار قطروں سے بڑھیا کو اتنا افاقت ہوا ہے کہ کل چار بیس مریضین کچھ لگل گئی اور پانی تک نہ پیا۔“

میں ہفت گوش بوزہ کی نختم ہونے والی تقریر سٹارہ اور وہ ہر لمحے جوش سے باتیں کرتا گیا۔ آخر اس سے مصافحہ کر کے گھوڑی پر سوار ہوا۔ میں سوچنے لگا، کیا یہ ڈاکٹر لوگ بھی اتنے حریص ہوتے ہیں۔ حریص اور بد دماغ! مریض کو دیکھا اور پھیل گئے۔ اور موئے شکار کی تاک میں بیٹھے رہے۔ کوئی نصیبوں کا مارا آپھناتا تو اس کی کھال اتار لی۔ یہ اچھی شرافت ہے۔

گھوڑی اڑی جا رہی تھی۔ آگے ایک موڑ تھا۔ میں نے اسے روکنا چاہا مگر وہ نہ رکی۔ جوں ہی مڑی تو پاچھے گز کے فاصلے پر ایک بڑھیار بیگنی نظر آئی۔ میں نے اپنی پوری طاقت سے باگیں کھینچیں۔ گھوڑی پچھلے پاؤں پر کھڑی ہو گئی اور بڑھیا چھپتی ہوئی کی کے مضبوط پودوں کو توڑتی کھیت کے اندر جا گری۔

”ہے بچہ! میں تو پہلے ہی مر رہی تھی۔“

معاف کرو مائی، گھوڑی بے قابو ہو گئی تھی۔ کہاں جاؤ گی؟“

”ہسپتال۔“

”کیوں؟“

اس نے ایک آہ بھری اور کھیت کے کنارے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”مر رہی ہوں بیٹا۔“ اس کے سفیدی مائل خاکستری بال مر جھائے ہوئے کافیوں کے آس پاس جنوں کی طرح لٹک رہے تھے۔ اس کی آنکھوں کے ارد گردا تعداد بھریاں تھیں اور ماتھے اور رخساروں پر بے شمار گہری لکیریوں نے تمام چہرے کو خوفناک حد تک بوڑھا بنا دیا تھا۔

اس نے اپنے کپڑے اور ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ ”پانی پی پی کر پیٹ اپھر جاتا ہے مگر پیاس نہیں بجھتی۔ تھوڑا تھوڑا بخار بھی رہتا ہے۔ دو چار سال میں جو باقی ہیں، انہیں آرام سے کامنا چاہتی ہوں، سوادھر آنکلی۔ جوان بیٹے ہیں، خبر نہیں لیتے۔ کھانتی ہوں تو ناک بھوٹ چڑھا کر اور میری ٹوٹی پھولی کھاث کو اٹھا کر مکان کے پر لے سرے پر آدمی گری آدمی کھڑی دیوار کے گرم سائے میں رکھ دیتے ہیں۔ اپنی والہوں سے چھٹے پڑے ہیں۔ کم بختوں کو یہ بھی یاد نہیں کہ ان کی پریوں کو میں نے ڈھونڈا۔ پانچ سال ماری پھر تی رہی۔ ان لڑکیوں کے ماں باپ کے پاؤں چو مے۔ اپنے گھر کا دانہ دنکا اکٹھا کر کے ان کے آگے لاڑا۔ مگر خیر بیٹا! زمانہ نازک ہے۔ اک بینی تھی چودھویں رات کے چاند کی طرح من موہنی صورت والی۔ پچھلے مینے ہسپتال میں مر گئی۔

نیاڈاڑا یا ہے۔ پانچ روپے مانگتا تھا، میرے پاس ایک چھپڑا (روپیہ) تھا، سواں نے خبر نہیں۔ روتنی، بلکن ترپتی ختم ہو گئی۔“ ہسپتال نزدیک تھا۔ میں نے سوچا، بڑھیا کو گھوڑی پر ڈال کر وہاں تک لے چلوں مگر وہ گھوڑی پر کہاں بیٹھ سکتی تھی! اور پھر یہ گھوڑی جو پچھلے پاؤں پر کھڑی ہو گئی تھی اورہ راضی نہ ہوئی اور میرا شکریہ ادا کرنے لگی۔ میں اسے تسلی دے کر ہسپتال کے بڑے گیٹ پر پہنچا۔

پاس ہی بیری اور توت کے پودوں سے نحیف اور مریل ٹھوڑا اور بلند قامت مگر کمزور نیل بندھے تھے۔ ایک اونٹ پیٹھ پر خالی کجا وہ اٹھائے گردن بلند کے ایک بیری کے پتے نوچ رہا تھا۔ آج تو میرا یضوں کی بھیڑ ہے، میں نے سوچا۔ ڈاکٹر کب میرے ساتھ چلنے لگا۔ اور پھر رستے میں اس کی جو تعریف سنی تھی۔ الہی توبہ!

میں نے گھوڑی ایک درخت سے باندھی اور برآمدے کی طرف بڑھا جہاں ڈاکٹر صاحب تشریف رکھتے تھے۔ ایک چوڑی میز پر بہت سے موٹے موٹے رجسٹر پڑے تھے۔ قلمدان کے پاس سرخ ربر کی کچھ نکلیاں ہی دھری تھیں۔ برآمدے میں غصب کی بھیڑ تھی۔ بے چارے سیدھے سادے دہقان ڈاکٹر صاحب کے پاؤں پر ہاتھ رکھ رہے تھے، گھٹنے چوم رہے تھے مگر وہ ایک اور صاحب سے قبے کی نئی خبریں سننے میں مصروف تھے۔

لباس تو میرا بھی اپنے علاقے کا تھا۔ لمبا سفید تہ بند، لمبی کھلی آستینوں والی سفید ٹیپیں، سفید گپڑی، ہاتھ میں چھڑی، مگر ایک چیز جس

سے مجھے خاص امتیاز حاصل تھا وہ یعنک تھی۔ کالج کے زمانے میں یعنک کی اس پر گئی تھی سو یہاں بھی نہ چھوٹی۔ ڈاکٹر صاحب میرے انگریزی طرز کے بال، سنبھری یعنک اور چھوٹی چھوٹی موصوفیات دیکھ کر رائے۔

انہوں نے اپنی یعنک کوتاک پر جمانتے ہوئے کہا۔ ”آئیے“

میں نے مصانف کے لیے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ ”آداب عرض“

”ایک عزیز سخت بیمار ہے، دین کوٹ جانا ہے، یہاں سے تین میل دور آپ تکلیف فرمائیں گے؟“

”ساتھ چلانا ہو گا مجھے یا بعد میں کسی وقت؟“

”میرے ساتھ اگر،“

”تو میرا خیال ہے ان مریضوں کو دیکھ لوں۔“

”ضرور میں انتظار کر سکتا ہوں۔“

”شکر یہ۔“

ڈاکٹر صاحب پھر اپنے ساتھی کی طرف مڑے۔ ”ہاں بھائی شام داس، پھر؟ پھر تم نے کیا کہا؟“

دلبلے پتے شام داس نے جواب دیا۔ ”میں نے کہا کہ اگر میرا بس چلتا تو میں ہندووں، مسلمانوں اور سکھوں سب کی گرد میں مروڑ کر کر کھو دیتا۔“

”خوب، پھر انہوں نے کیا کہا؟“

”کہنے لگے اتحاد چاہیے اتحاد!“ میں نے کہا۔ ”بھائی آگ پانی میں بھی بھی ملاپ ہوا ہے؟ ہندو اور مسلمان اور مل جل کر رہیں؟ اس دنیا میں تو یہ مرحلہ طے ہونے سے رہا۔ سب لوگ نئے سرے سے جنم لیں تو شاکر یہ کام بن جائے۔“

”پھر؟“

”پھر جناب بہت کھیانا ہوا۔ ہار مان گیا۔ کہنے لگا۔ ”تم سا ہو کاروں سے بات کرنا سوکا گھاٹا ہے۔ تم لوگ متعصب ہوتے ہو،“

”واہ رے بیٹا! خوب کہی۔ ہم آزاد اور خیال لوگ ہمیں تعصب سے واسطے؟ اب دیکھی آپ نے آج کل کے ہندوستانیوں کی ذہنیت اور جو کل ان سے مذکور ہو جائے تو ان کے عقیدے بالکل اٹھے ہوں گے۔ قلاباز یاں کھاتی رہتی ہے ان کی ذہنیت۔ ہوا مقابل دیکھی اور رنگ بدلتا۔“

ایک بزرگ صورت ادھر عمر کا شخص جو کوئی ملک معلوم ہوتا تھا، برآمدے کے ستون کے پاس نمودار ہوا اور کہنے لگا۔ ”ڈاکٹر جی!“
ڈاکٹر صاحب نے عینک اتار کر میز کے دراز سے ایک بیٹری نکالتے ہوئے کہا۔ ”ہوں“

بزرگ نے اسی لجاجت اور حیل اطمینانی سے کہا۔ ”بڑی دیر سے کھڑا ہوں۔“

”تو پھر میرا دماغ کیوں چاٹتے ہو۔ دو چار منٹ یہاں نچلے نہیں بیٹھ سکتے۔ اتنی جلدی تھی تو گھر ہی میں پڑے رہتے۔“

”میری بیٹھی مر رہی ہے حضور! اس کے کوارٹر میں اسے جا کر دیکھ بجھے یا کچھ دبجھے۔“

”زہر دوں؟ کیا دوں؟ کل واںی میڈی سن کدھر ہے؟ دواںی؟“

”پلاوی تھی حضور۔“

”ب؟“

”ایک ہی خوراک تھی۔ کپونڈر صاحب نے ایک ہی خوراک دی تھی۔“

اچھا نہ ہردو۔“

اور ڈاکٹر پھر سام داس کی طرف جک گیا۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کرتی کو میز کے قریب کھینچتے ہوئے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب ایک عرض ہے۔“

”فرمائیے۔“

”آپ کاروی غریب دہقانوں کے ساتھ اچھا نہیں۔ آپ کو تو ہر ایک سے مہربانی اور خندہ پیشانی سے پیش آتا چاہیے۔“

ڈاکٹر نے ذرا اکثر کر کہا۔ ”تو حضور! میرا یہ تو فرض نہیں کہ ہر ایک کے آگے جھلتا پھر دوں۔ جو آئے اس کے لیے کرسی خالی کر دوں۔ دوائی مانگنے تو اسے چار چار سیر کی بوتلیں لباب بھر دوں۔ میرا فرض ہے نہیں لکھنا اور دوسرے کی بخش دیکھنا، سو یہ ہوتا رہتا ہے۔ میں سرکار کا ملازم ہوں حضور سرکار کا۔“

”اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ آپ کسانوں کو اپنی سخت کلامی کا نشانہ بناتے رہیں۔ میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ آپ غلطی کر رہے ہیں۔ ڈاکٹروں اور حکیموں کی سیرت کا نمایاں پہلو مہربانی اور رحم ہوتا ہے۔ آپ کو میری یہ نصیحت یاد رکھنا چاہیے ورنہ اس کا پھل بہت کڑوا ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب! یہاں کے لوگ صرف سادہ ہی نہیں جاہل بھی ہیں۔ اگر یہ دہقان سادوگی چھوڑ کر جہالت کی طرف مائل ہوں تو اپ کو سرچھپا نے کو جگہ نہ ملے۔“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”اپ تو بہت گرم ہو رہے ہیں۔ میں تو غلام ہوں ان غریبوں کا۔ سرکار ملازم پبلک کا ملازم ہوتا ہے۔ دوچار با تین ادھر ادھر کی کر لیں تو کوئی ہرج نہیں ہوا۔ آپ بے جانختی کر رہے ہیں۔ باں بھائی ادھر آؤ، زبان نکالو۔ انھوں“

ڈاکٹر مریضوں کی طرف متوجہ ہو گیا شام و اس سلام کے بغیر ڈاکٹر کی کرسی کے پیچھے سے بلی کی طرح کھڑک گیا۔ اس کی خوف زده نگاہوں سے معلوم ہوتا تھا کہ آج میرا ہسپتال آنا اس کے نزدیک ایک حادثہ ہے جس کی وجہ سے ڈاکٹر کے حلقة احباب میں کھلبلیل مجھ جائے گی۔ کمپاؤنڈ کھڑکیوں سے سر نکالے مجھے تجب اور غصے سے گھور رہے تھے۔ دہقان میری کرسی سے چھٹے پڑے تھے۔ وہ سب میرے منون نظر آتے تھے۔ میری نظر گیت پر پڑی تو وہ بڑھیا آتی دکھائی دی۔ میں اٹھا اور اسے بازو سے پکڑ کر ڈاکٹر کی کرسی کے قریب لے آیا۔

ڈاکٹر چٹ پر چٹ لکھے جا رہا تھا۔ اس کی نبض پر ہاتھ دھرا اس کا پیٹ مٹوا۔ اس کی زبان دیکھی، اس کی آنکھیں کھولیں۔ اور قلم فر弗ر کرتا ہوا تین چار چیزوں ختم کر کے ایک اور کاغذ پر چلنے لگا۔

”نام کیا ہے؟ عمر کیا ہے؟ کہاں کے رہنے والے ہو؟ یہ لو جاؤ پرسوں اور دو ایسی لے جانا۔“

یہ الفاظ بار بار اس کی زبان پر اس تیزی سے آتے تھے کہ بے چارے دہقان نام کی جگہ عمر اور عمر کی جگہ اپنے گاؤں کا نام بتا دیجتھے۔ ڈاکٹر کے اروگر دھیرت بھری آنکھوں کا ہجوم تھا اور وہ ان کے اضطرابوں اور پریشانیوں سے بے پرواں گھستا جا رہا تھا اور سیاہی ضائع کر رہا تھا۔ مگر خیر میرے الفاظ نے کچھ اثر تو کیا۔ اتنا تو ہوا کہ اب چار بجے سے پہلے ہی میرے ساتھ چل پڑے گا۔ بے چارہ مجھے سے خوف کھا گیا تھا۔ اس نے جانتا یہ کوئی ”پہنچ والا“ آدمی ہے۔ بڑھیا کی باری آئی وہ کاپتی ہوئی ڈاکٹر کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

ڈاکٹر نے صرف میری خاطر بڑھیا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”زبان نکالو۔“

بڑھیا نے ذرا سی زبان ہونتوں سے باہر نکالی۔

ڈاکٹر نے کہا۔ ”اور نکالو۔“

بوزھی نے زبان کو پھر اندر کھینچتے ہوئے کہا۔ ”بس اتنی سی ہے ڈاکٹر صاحب!“

مجھے بڑھیا کی اس بھولی بھالی بات پر بے اختیار نہیں آئی۔ دو ایک مریض بھی ہنس پڑے مگر ڈاکٹر کے ہونتوں پر مسکراہٹ تک بھی نمودار نہ ہوئی۔ میں نے بڑھیا سے کہا۔ ”بڑی اماں! منہ کھول کر دکھا دے۔“

بڑھیا نے اس زور سے منہ کھولا کہ جزوں سے جھیل جھیل کی آواز آنے لگی۔ ڈاکٹر نے بڑھیا کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ وہ ڈاکٹر کے

چہرے کو گلکنلی باندھے گھور رہی تھی اس وقت اس کی نظروں میں ڈاکٹر خدا کی حیثیت رکھتا تھا۔

”پانی پیتی ہوں حضور مگر پیتے ہی اور پیاس لگتی ہے۔ بخار بھی رہتا ہے۔ سر میں!“

ڈاکٹر نے اسے کاغذ دیتے ہوئے کہا۔ ”بس بس کافی ہے۔“

”کہاں لے جاؤں؟“

ڈاکٹر نے بغیر کوئی اشارہ کئے ایک اور مریض کی بیٹھ پر انگلیاں رکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”ادھر“

میں نے سوچا یہ ڈاکٹر تو فرعون ہے۔ یہ تو اپنے ہم جنوں کو چیزوں سے زیادہ وقعت نہیں دے رہا۔ اسے تو سمجھانا چاہیے۔ اور وہ افسانوں والا ڈاکٹر، وہ تو کوئی فرشتہ معلوم ہوتا تھا۔ ایسے ڈاکٹر ادھر کیوں نہیں بھیجے جاتے۔ ایسے ڈاکٹر ہوتے بھی ہیں دنیا میں؟ وہی بزرگ پھر برآمدے کے اس سرے پر پکارتا نظر آیا۔ ”حضور! میری لڑکی۔“

ڈاکٹر نے اس کی طرف تھہر آلو نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”پہلے کہاں مر گئے تھے؟“

میں نے دیکھا بزرگ کارنگ کا رنگ اڑ گیا۔ وہ بھیڑ کو چیرتا ہوا میز کے پاس آ پہنچا اور گرج اٹھا۔ ”کیا بکا ہے تم نے؟ تمہیں شرم تو نہیں آتی؟ صبح سے میں تمہاری منتیں کر رہا ہوں اور تم سیدھے منہ جواب تک نہیں دیتے اتم سمجھتے کیا ہوا پنے آپ کو؟ میں اشارہ کروں تو یہ کسان تمہاری تمہاری..... بو شیاں نوج لیں۔ تم سمجھتے ہو یہ دنیا تمہاری غلام ہے؟ تم غلام ہو سمجھے؟ تم ہمارے غلام ہوں۔ کیوں ملک جی!“

میں نے جواب دیا۔ ”جی ہاں۔ ڈاکٹر صاحب بہت ٹیزھی راہ پر جا رہے ہیں۔“

ڈاکٹر نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”آج کس بد بخت کامنہ دیکھا تھا میں نے کہ مجھے ان بد دماغوں سے پالا پڑ گیا۔ اگر آپ ہر دو حضرات کا رویہ بھی رہا تو مجھے مجبوراً تھا نے میں اطلاع دینی پڑے گی۔“

میں نے کرسی کو چیچھے دھکلیتے ہوئے کہا۔ ”بھاگو۔ ابھی بلا لا او نہیں۔“

”تھانے والے بھی تم سے نگ ہیں۔ کل ایک سپاہی کا بچہ وقت پر دوائی نہ پہنچنے سے جاں بحق ہو گیا۔ وہ جلے بیٹھے ہیں بے چارے۔ تھانے تک جاؤ تو سہی تمہیں سمجھاویں گے!“

بزرگ اپنے اصلی رنگ میں نمایاں ہوتا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر سر جھکائے برآمدے سے باہر نکل گیا۔ بزرگ اس کے پیچھے پیچھے ہو گیا۔ کسان میرے ارد گرد اکٹھے ہو گئے۔ ”ملک جی، آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟ آپ نے اس کی خوب خبر لی۔ آپ جیسے

پڑھے لکھے ہمارا ساتھ نہ دیں تو یہ لوگ تو ہمارے کپڑے بھی اتار لیں۔ آپ ہمارے مائی باپ ہیں۔ آج آپ نہ ہوتے تو جانے یہاں کب تک بیٹھنا پڑتا۔“

غرض جس کے جی میں جو آئی، کہا گیا۔ ایک نوجوان جس نے ہاتھ پر پٹی باندھ رکھی تھی۔ بولا اور ملک صاحب دس دن ہوئے میں یہاں آیا۔ یہ صاحب کہنے لگے کہ سوئی ڈالی جائے گی پھوڑے میں، تب اچھے ہو گے۔ میں مان گیا۔ مجھے اندر لے گئے پہلے جیب سے دس آنے کا کال لیے پھر ایک اونچے سے پنگ پر لٹا دیا۔ میرے ہاتھ کو ایک صاحب نے پکڑا۔ بڑے صاحب نے ایک سوا جس کے نیچے نالی تھی۔ میرے پھوڑے کے اندر داخل کر دیا۔ میں چلا اٹھا توڑا کثر جی بہنے لگے۔ ہاتھ کا پ گیا اور سوا میری ہڈی میں گھس گیا۔ اب ادھر کھینچتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ہستے جاتے ہیں اور میرا جیسے دماغ خنجروں سے کاتا جا رہا ہے۔ مجھے جیسے کسی نے شکنے میں بھیجن دیا ہے۔ خدا خدا کر کے سوا بہر نکالا مگر ٹوٹا ہوا۔ اس وقت نشتر سے میرا ذخم چیر دیا۔ ہڈی سے وہ ٹوٹا ہوا پر زہ نکالا اور باہر آ کر کہنے لگا، ”تمہاری ہڈی میں بھی دوائی چلی گئی۔ اب تم عمر بھر بیمار رہ ہو گے۔“ یہ بھی کوئی شرافت ہے! اور اگر میں خود کی کچھے ایک گھونسا جما دیتا؟

مجھے نوجوان پر رحم آیا ادھر اس بڑھیا کا خیال آگیا۔ تیزی سے کپاؤ نڈر کے کمرے میں گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ بڑھیا سامنے بوٹ رکھے رہ رہی ہے۔ میں نے پوچھا۔ ”کیوں اماں رو کیوں رہی ہو؟“

بڑھیا نے اپنی نیجف آنکھیں اٹھائیں۔ بوڑھوں کی آنکھوں میں آنسو ڈب بہا آجیں تو خدا جانے دل کیوں ڈوبنے لگتا ہے اور کائنات خطرے میں کیوں نظر آتی ہے؟ اس بڑھیا پر اس ”شفا خانے“ والوں کو رحم نہیں آتا کیا؟

اس نے اپنے پھٹے پرانے پلو سے آنسو پوچھتے ہوئے کہا۔ ”اپنے نصیبوں کو رہ رہی ہوں میٹا۔ رہ رہی ہوں کہ یہ بایو دوائی نہیں دیتا۔ کہتا ہے چار آنے لوں گا۔ میرے پاس اکنی تھی وہ دے دی ہے، مگر اکنی اسے منظور نہیں۔“

میں نے قدرے تھکمانہ لجھے میں کہا۔ ”کپاؤ نڈر صاحب!“

اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔ ”فرمائیے“

”اے دوائی دے دیجئے“

”آپ کو کیا حق حاصل ہے کہ آپ ہسپتال کے ہر کام میں دخل دیتے پھرتے ہیں؟ دوائی دینا یا نہ دینا ہمارا کام ہے۔ آپ دوائی لینے آئے ہیں تو لے جائیں ورنہ اس کمرے سے باہر تشریف لے جائیے۔“

دوروں

کپاڈہ نے سلندھ کو میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”ورنہ کیا؟ ورنہ تم کیا کرو گے؟ تم کیا کر سکتے ہو؟“

مجھ سے نہ رہا گیا اور گھونساتاں کراس کی طرف بڑھا۔ ”میں کیا کر سکتا ہوں؟“

وہ بھی غضبناک بلی کی طرح مجھ پر جھٹا۔ میں نے جو ایک گھونساجزوں میں جایا تو میز کے نیچے اونٹھے منڈ جا گرا۔ ہبتال کے ملازم دہقان اور دوسرے لوگ دوڑے آئے۔ خود ڈاکٹر بھی آن دھمکا۔ دوائی لے کر بڑھیا کو دی۔ وہ مجھے ہزاروں دعا بھیں دیتی چل گئی۔ ڈاکٹر نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے میں اس کی خود مختار حکومت میں ایک غیر ملکی حملہ آ رہوں۔ میں پھر کرسی پر آ بیٹھا۔

ڈاکٹر بدستور مریضوں کو دیکھنے میں مصروف رہا۔ چار بجے سے پہلے میں نے کوئی پائچ دفعہ اس سے کہا کہ اب مریض ختم ہو چکے ہیں میرے ساتھ چلو مگر وہ اپنے ضد پر اڑا رہا۔ وہ اور بے نیازی سے کہہ دیتا۔ ”شاید کوئی اور آ جائے۔“ پھر ”ملاپ“ کا پرچہ دیکھنے لگتا۔

کوئی چار بجتے والے ہوں گے کہ ایک ملازم ڈاکٹر کے کوارٹر کی طرف سے بھاگا بھاگا آیا اور ہانپتا ہوا بولا۔ ”حضور! انھی رادھا کی حالت پہلے سے بھی خراب ہے۔ جلدی تشریف لا یئے۔“

ڈاکٹر کے چہرے پر ٹکریا تردد کے کوئی آثار غمودار نہ ہوئے مگر اس نے میرے پاس سے گزرتے ہوئے کہا۔ ”میں آج نہیں جاسکوں گا۔ مجھے کل لے جائیے گا۔“

میں نے دو قدم آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ”مگر ڈاکٹر صاحب! امیر اعزیز تو سخت۔“

”تو جتاب میر اعزیز بھی سخت یہاں رہے۔ میں معدود رہوں۔“

میں اس کو کیا کہہ سکتا تھا۔ میں اسے کیسے مجبور کر سکتا تھا۔ میں کرسی پر سے اٹھا۔ بھوکی گھوڑی کی طرف دیکھا جو دروازہ کے انداز میں ہنہنائی۔ ڈاکٹر کے کوارٹر پر نگاہ ڈالی۔ ایک نفحی یا لڑکی دروازے کے پاس گیندے کھیل رہی تھی۔

میں نے ایک ملازم سے پوچھا جو ابھی ابھی قبے سے آ رہا تھا۔ ”یہ لڑکی کون ہے؟“

”یہ رادھا ہے، ڈاکٹر بھی کی لڑکی۔“

”یہ تو بھلی چلتی ہے! ڈاکٹر صاحب کو ذرا ایسا دو گے؟“

”جناب ان کا حکم ہے کہ میں اندر جاؤں تو جو شخص آئے اسے نوکری سے برخاست کر دیا جائے گا۔“

اور جب میں نے گھوڑی کو درخت سے کھولا تو کپاونڈ را اور ملازم برآمدے میں کھڑے مسکارا رہے تھے۔ میں نے رکاب میں پاؤں رکھا۔ گھوڑی اڑنے لگی مگر دور تک میں نے ایک کرخت قبیله اپنے پیچھے گو جانا۔ گھر آیا تو میرا عزیز ڈاکٹر کے وقت پر نہ پہنچنے کی وجہ سے بے ہوش پڑا تھا۔ صبح تک وہ سرد ہو گیا۔



بُوڑھا سپاہی

انگلیوں سے بھویں انھا کر دیکھنے والا بُوڑھادھقان راستے میں ایک ابھرے ہوئے پتھر سے لٹھی نکراتے ہوئے بولا۔ ”یہ بڑی بھی کہانی ہے ملک جی! آپ سنیں گے تو تسلیک آ جائیں گے۔ آپ بابلوگوں کے لیے ہماری باتوں میں کیا خاک دچپی ہوگی۔ ہماری باتیں ہوتی ہیں ڈھورڈگروں کے متعلق یا میلے ٹھیلے پر کسی نے کسی کی گپڑی اچھال دی تو ہفتون تک چوپال پر بیٹھنے والوں کا موضوع ہی یہی رہا۔ کسی کا کتا جیت گیا تو سارے جہان کے کتوں کی قسمتیں گن کر رکھ دیں اور ان سب کا سردار اپنے کتبے کو بنایا۔ میں نے ملک جی! فوج میں بھی کام کیا۔ بڑی لام میں بھی رہا۔ فرانس سے زیادہ خوبصورت ملک میں نے کہیں نہیں دیکھا ملک جی! ہر طرف سبزہ زار، ہر طرف پھول ہی پھول۔ خوشبو میں بھی ہوئی ہوا نہیں اور پھر لوگ اتنے خوش پوشک اچھے اور نرم مزاج کہ آپ ہندوستان سے جائیں تو وہیں کے ہو رہیں اور وہاں کا حسن دیکھ کر تو ہم تو پوں کی دوں دوں اور بھوں کے دھماکوں سے بھی بے پرواہ ہو گئے تھے۔ میرے خیال میں تو خدا نے فرانس کو اپنی جنت کے نمونے پر بنایا ہے۔ مجھے زخمی ہونے پر ولایت بھیجا گیا۔ برٹن یا برٹن اس نام کا ایک شہر تھا۔ ایک سال وہاں ہسپتال میں رہا۔ آخر میرا بایاں بازو کاٹ دیا گیا ملک جی! دنیا خوب دیکھی ہے۔ اب دعا ہے کہ خدا ایمان نصیب کرے۔ آرام اور سکون سے مروں۔ میری کہانی تو یہی ہے ملک جی! اور آپ کیا سنیں گے؟“

میں نے اپنے ایک دوست سے سن رکھا تھا کہ پچھائی کے گاؤں میں ایک بُوڑھادھقان ہے جس کا بایاں بازو کٹ گیا ہے۔ اس سے اس علاقے کا ایک ایسا رومان وابستہ ہے جو صد یوں تک زبان زد رہے گا۔ یوں تو اس رومان سے علاقے کا بچ پچ واقف ہے لیکن اگر خود اس کی زبانی سنا جائے تو بے حد لطف آتا ہے۔ سنان چراگاہ میں پھرتے پھرتے ۰۱۶ میں نے اس دھقان کو ڈھونڈ نکالا تھا۔ اس نے ہزار بھانے بنائے۔ کترانے کی لاکھ کوشش کی لیکن میں نے کہا۔ ”بابا میں تو تیری کہانی سن کرہی ٹلوں گا۔ میں اتنی دور سے آیا ہوں اب یوں ہی واپس لوٹ جاؤں تو یہ دکھمرتے دم تک مجھے ستائے گا۔ تم مجھے سنادو تمہارا کیا بگزے گا، کامیں تو تمہاری چرہ ہی ہیں اور ابھی دوپھر کا وقت ہے۔ شام پڑے تم واپس گھر جاتے ہو گے۔“

بُوڑھے نے تاک بھوں چڑھا کر اپنا سفید سر ہلاایا اور بولا۔ ”اچھا چلنے اس بروئے (بیری کا چھوٹا سا درخت) کے نیچے جا بیٹھیں۔ میری کہانی میں کوئی خاص بات تو ہے نہیں۔ چلیئے!“

بروئے کے نیچے اس نے اپنی چادر بچا دی۔ اس پر ہم دونوں بیٹھے گئے پھر اس نے ایک پوٹلی کھوئی۔ ایک روٹی اور ایک بڑا سا پیاز نکالا۔ پیاز کو پتھر پر رکھ کر توڑا اور بولا۔ مجھے کھائے۔

ہم دونوں نے اکٹھا کھانا کھایا۔ میں نے بڑی بڑی عظیم اشان دعوتوں میں حصہ لیا مگر اس سوکھی روٹی اور کڑوے پیاز کی لذت مجھے مرتبہ دم تک یاد رہے گی۔ مجھے ان لوگوں کے ساتھ فطرتاً بہت انس ہو جاتا ہے جنہوں نے کبھی محبت کی ہو اور یہ بوڑھا تو اس علاقے کا ہر داعز نہ ہیر دھا۔

کھانا کھا کر اس نے کہا۔ ”جو انی میں ملک جی! گلایا چلتا تھا کہ اچھے اچھے گانے والے اپنے گھروں میں دبک بیٹھے تھے۔ اب پھیپھڑوں میں دم نہیں رہا لیکن پھر بھی عشق کی داستان میں اگر گانے نہ ہوں تو سارا مزہ پھیکا پڑ جاتا ہے۔ میں گاؤں کا ضرور، لیکن آپ میرے اس جنون پر ہٹنے گا نہیں۔ میں جب اپنی دکھ بھری کہانی بیان کرنے لگوں تو مجھے پرانے زمانے کا ہر منظر زندہ کرنا پڑتا ہے، اور یہ صرف گانے سے ہو سکتا ہے۔“

اس کے بعد اس نے کانوں پر ہاتھ رکھا۔ ایک دوبار گلا صاف کیا اور ٹھیک ٹھیک بخابی میں ایک لطیف گیت گایا۔

”اویمیرے محبوب! تمہاری آنکھیں اس حشی ہرن کی سی ہیں جو گہری گھائیوں میں اپنے پچوں کے ساتھ کلیلیں کر رہا ہوا۔“

”اویمیرے محبوب! تمہارے بال سورج کی ان باریک لانبی کرنوں کے سے ہیں جو مشرق کی طرف آسمان پر بکھر جاتی ہیں۔“

”اویمیرے محبوب! تمہارا چہرہ اس شر میلے چاند کا سا ہے جو ساون کی راتوں میں گہرے باولوں کے پیچے سے باجرے کے نو دمیدہ پودوں کو جھانکتا ہوا۔“

”اویمیرے محبوب! تم کیا ہو؟ میں تمہیں نہیں سمجھ سکا۔ تم مجھے کیوں چھوڑ گئے۔ تم کہہ چلے گے؟“

اس بڑھاپے میں بھی اس کی آواز سے سنسان چراگاہ گونج آئی۔ گامیں گھاس چڑنا بھول گئیں۔ چڑیاں بروئے کی مخفی شاخوں پر دم سادھ کر بیٹھ گئیں دواریک جھاڑی کے پاس ایک نحاساچر وابا آنکھیں ملتا ہوا جاگ اٹھا۔ بوڑھے کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے گیت ختم کر کے میرے کاندھے پر ہاتھ دھرا اور بولا۔ ”ملک جی! آپ تو اس ہو گے۔ آپ اتنے نرم دل ہیں اور میری کہانی اتنی دردناک ہے! آپ تو گھبرا جائیں گے ملک جی! ابھتر ہے آپ کہانی نہ شیں۔“

میں نے کہا۔ ”بابا! میں نے کئی دردناک کہانیاں سنیں۔ کئی غمناک کہانیاں میرے سینے میں محفوظ ہیں۔ خود میں بڑا کھلی ہوں بابا! تم اپنی داستان کہتے جاؤ۔ محبت کی داستان میں سنتے سنانے والے سب روئیں تو مزا آتا ہے۔ محبت کی خوراک آنسو ہیں بابا! تم تو اس

بات سے خوب واقف ہو گے۔"

بوزھے نے اپنی کھر دری پگڑی سے آنکھیں ملیں۔ ایک پتھرا اٹھا کر ایک گائے کی طرف پھینکا جو فصل کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ پھر میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا۔ "ملک جی! دنیا میں ہر شخص کے ساتھ محبت کی کوئی نہ کوئی کہانی چھپی ہوتی ہے۔ ہیرا مجھے کے تھے کو ایک گاؤں میں کئی کئی بارہ ہرایا گیا ہے اور دہرایا جا رہا ہے۔ کے معلوم کتنے دلوں میں محبت کی چنگاریاں اب تک سلگ رہی ہیں۔ ان مسکراتے ہوئے چھروں کے پیچھے کون جانے کتنی فریادیں چھپی ہیں۔ میری کہانی کوئی نہ کہانی نہیں، بس ایک دکھے دل کی پتا ہے۔ میں نے محبت کی! مجھ سے محبت کی گئی اور اچانک تقدیر نے کچھ ایسا پلاٹا کھایا کہ امیدوں کی ساری بساط الٹ گئی۔"

"اوہ ملک جی! آپ نے آج بھجی ہوئی راکھ پر انگارہ رکھ دیا تا کہ یہ پھر سے سلگ اٹھے۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ میں نے زندگی میں صرف ایک بار اپنی کہانی ایک دوست کو سنائی تھی جس نے اس قدر عام کر دیا کہ اب جدھر جاؤں مجھ پر انگلیاں اٹھتی ہیں۔ جو راز فاش ہو جائے، اس پر دنیا حیران ہو جاتی ہے حالانکہ اس سے زیادہ بڑے راز لوگوں کے دلوں میں چھپے ہوتے ہیں۔ اب میں آپ کے آگے اپنی کہانی بیان کر رہا ہوں۔ شاید آپ کے دل میں اس کہانی سے زیادہ دردناک کہانی چھپی ہو۔ عشق و محبت کا یہی تو زمانہ ہے! بہر حال آپ نہیں اور سن کر بھلا دیں۔ دوسروں کے دکھوں سے اپنا دل دکھانا بڑا امہنگا سودا ہوتا ہے۔"

"میں ایک اچھے کھاتے پیتے کسان کا اکلوتی پیٹا تھا۔ تین جماعتیں بھی پڑھا ہوں۔ خط لکھ پڑھ سکتا ہوں۔ میرے باپ کا ارادہ تھا کہ مجھے کسی سکول میں منشی بنادیا جائے مگر میں پڑھنے کی بجائے کھیلوں میں زیادہ مگن رہتا تھا اس لیے تین جماعتیں پاس کرنے کے بعد باپ نے مجھے کھیتوں پر بلا لیا۔ اب جوں نہیں سے واسطہ پڑا تو مدرسے کی یادستانے لگی مگر ہوتے ہو تے طبیعت بہل گئی۔ کبھی کبھی باپ کو ستابے کا موقع دیتے کے لیے میں کھیتوں میں ہوا تھا۔ جوان ہوا خون میں گرمی آنے لگی۔ کوئی نو خیز لڑکی میرے پاس سے گزرتی تو میرا ہاتھ از خود میری پگڑی کی طرف جاتا اور اسے سر پر جماتا، طرے کو پھیلاتا، بالوں کی ایک لٹ رخسار کی طرف کھینچ لاتا اور ہاتھی دانت کے چکتے ہوئے نخنے لگانے کے کوکان کے پاس جمادیتا، میں کئی کئی گھنٹے اپنے گھر کے دروازے پر بینچ کر گلی میں آنے جانے والوں کو گھور گھور کر دیکھتا اور جب آنکھوں کو کچھ حاصل ہو جاتا تو دیر تک میرے دل میں عجیب عجیب خیالات گھوما کرتے۔

یہاں کھینچ کر بوزھے نے گلا صاف کیا اور گانا شروع کر دیا۔

"اے جوانی کے زمانے! تو ایک خواب ہے جو پوچھنے آتا ہے اور پھر سورج کی کرنوں سے ڈر کر بھاگ جاتا ہے!"

”تو ڈھلتی پھرتی چھاؤں لے ہے، تو ایک سایہ ہے جس کا کوئی پیچھا نہیں کر سکتا!“

”تو ایک بادل ہے جو برس کر خدا جانے کدھر گرم ہو جاتا ہے!“

”تو ایک چنگاری ہے جو ایک بار بھڑک کر راکھو ہو جاتی ہے!“

وہ تنگے سے زمین کریدتے ہوئے آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ ”ایک دن ہمارے دروازے کے سامنے سے ایک لڑکی سر پر ایک برتن اٹھائے ہوئے گزری اور میرے ہاتھ سے ہندو چھوٹ کر خاک پر گر گیا۔ کھانا کھانے کا وقت تھا لیکن میں ماں کی چیخ پکار سے بے پرواہ ہو گئیں بیٹھا رہا۔ آخر وہ دوپھر کو واپس آئی۔ اس نے مری طرف دیکھا اور ماتھے پر اوزھنی جھاتی اور سینے پر بھیلاتی ایک طرف مز گئی۔ میری ریگیں لوہے کی سلاخوں کی طرح اکڑ گئیں۔ چاروں میں نے پھر اس لڑکی کا انتظار کیا لیکن وہ نظر نہ آئی۔ آخر پانچ یوں روزوہ پھر اس گلی سے گزرتی دکھائی دی۔ سامنے ایک دکان تھی، وہ اس میں داخل ہو گئی۔ میں بھی وہیں پہنچ گیا۔ اس نے گز نمک اور صابن خریداً دکاندار کو ایک روپیہ دیا لیکن اس نے بجا کر واپس کر دیا اور کہنے لگا۔ ”یہ تو کھونا ہے۔“

وہ تعجب سے بولی۔ ”کھونا ہے؟“

میں نے پہلی بار اس کی آوازنی۔ ”تو پھر یہ سودا رکھو۔ میں کل آکر لے جاؤں گی۔“

یہ کہہ کر وہ نہایت مایوسی سے پوٹلیاں کھولنے لگی۔

میں نے دکاندار سے کہا۔ ”نو ازیار! وہ روپیہ مجھے بھی دکھانا فراہ؟“

”لڑکی نے مزکر میری طرف دیکھا اور پوٹلیاں کھولنا بھول گئی۔ وہ خوبصورت تھی یا نہیں، اس سے مجھے کیا واسطہ! وہ میرے دل اور دماغ پر نشہ بن کر چھا گئی۔ میں نے اس کا روپیہ انگلیوں پر بجا یا تو پسلیوں کے اندر میرا دل بھی بری طرح دھڑکا! میں نے اپنی جیب سے ایک روپیہ نکالتے ہوئے کہا۔“ لو۔ یہ تو محیک ہے نا؟ یہ روپیہ میں ہر کارے کو دے کر ڈاک خانے میں چلوالوں گا۔“

لڑکی نے مری طرف حیران ہو کر دیکھا اور بہت رسیے لجھ میں بولی۔ ”مگر..... مگر میرا اگھر تو نزدیک ہی ہے۔ پھاگنی دکوس تو ہے یہاں سے۔ میں کل سودا لے جاؤں گی۔“

میں نے کہا۔ ”کیا ہرج ہے؟“

پھر میں دکان سے باہر کل آیا اور دو درستک اسے پوٹلیاں سر پر جمائے تیزی سے پھاگنی کی طرف جاتے دیکھتا رہا۔

پھاگنی! پھاگنی! خوانخوار طالم لوگوں کا گاؤں۔ قاتمکوں کا گھر۔ گناہ اور جرم کا کارخانہ..... جہاں جھوٹ اور فریب کا بازار گرم

ہے۔ یہ لڑکی وہاں کی رہنے والی ہے! کیا آگ کے شعلوں میں پانی کی بوند سما سکتی ہے؟ کیا انگاروں کے ہجوم میں پھول کملانہیں جاتا؟
”دوسرے دن میں پھاٹگی جا پہنچا۔ چھوٹا سا گاؤں ہے، آپ نے شاید دیکھا ہو گا۔ میں ایک گلی سے گزر رہا تھا کہ پیچھے سے آواز
آئی۔“ کیسے آنا ہوا ملک جی؟“

میں نے مرکر جو دیکھا تو کانوں میں ایک گونج سی پیدا ہونے لگی جیسے رات کے وقت کسی گھنے جنگل میں آندھی سے پیدا ہوتی
ہے۔ میں نے مشکل سے کہا۔ ”مجھے یہاں ایک کام تھا۔“
اس نے پوچھا۔ ”پانی والی بخوبیں گے آپ؟ حقہ لاوں؟“
”نمیں۔“

خداجانے میں نے یہ کیوں کہہ دیا؟

اس نے پوچھا۔ ”اب واپس چلے جائیں گے آپ؟“
”میں نے کہا۔“ باں“

وہ بولی۔ ”اگر وہ گزارنا ہوتا تو میرا گھر حاضر ہے۔ وہ سامنے چھپر والا مکان ہے ہمارا۔“
میں نے کہا۔ ”بہت اچھا۔“

وہ مسکرائی اور اپنے گھر کی طرف چلی گئی اور میں بہوت و پریشان اپنے گاؤں کو واپس آگیا۔
بوڑھا کچھ دیر اس معموم شخص کی طرح خاموش رہا جو آنسو روکنے کی کوشش میں اپنے ہونٹ بھینچ لیتا ہے۔ آخر میری طرف دیکھا
اور کانوں پر ہاتھ رکھ کر گانا شروع کر دیا۔

”اوچاندی رات میں مست ہواوں پر سوار ہو کر اپنے دلیں کو جانے والی کونج!“ ”تیراز خی دوست ایک خاردار جھاڑی میں پڑا
دم توڑ رہا ہے!“

”اس کا جسم خون سے آلو دھے ہے اور اسے جنگلی چیزوں میں چھٹ رہی ہیں۔“

”اونچوب صورت کو نجح! قافی کو چھوڑ کر ادھر آ جا، کیوں کہ صرف تو ہی اس کے زغمون کو مندل کر سکتی ہے!“
بوڑھا ضبط نہ کر سکا اور بے اختیار روتے ہوئے چادر میں منہ چھپا لیا۔

خاموش اور سنان وادی! ہوا ساکن! اور بوڑھے کی دروناک آواز جس میں کئی غم انگیز افسانے کروٹیں لیتے نیلے آسمان کی

طرف رقص کرتے جا رہے تھے۔ میری آنکھوں میں آنسو بھرائے جو پلکوں ہی پر خشک ہو گئے۔ آنسونہ پوچھنے میں جولناست ہے اس کا احساس صرف ان رونے والوں ہی کو ہو سکتا ہے جنہوں نے سردیوں کی طویل راتوں میں روتے روتے تکیے بھگو دیے گئے پلکوں تک رومال نالے لے گئے!

بوڑھے نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ملک جی! آج میرے زخم چھل گئے۔ ان پر چھاہار کھنے والے کب کے چل بے؟ اب یہ مرتے دم تک رہتے ہی رہیں گے۔ ملک جی! آپ نے ایک بوڑھے سپاہی کو ناجن چھینڈ دیا۔

آپ نوجوان ہیں، کم عمر ہیں۔ آپ نہیں جانتے کہ پرانے سازوں سے ایک بے ربطی گونج کے سوا اور کچھ پیدا نہیں ہوتا! میں تو آپ کو معمولی معمولی باتیں سن رہا ہوں، میرا کی وجہ چیز کر دیکھیں تو آپ کا دل دل جائے اور پھر کسی غمزدہ شخص کو چھینڈ نے کی جرات نہ ہو۔“

بوڑھے کی آواز سے غصہ نمایاں تھا!

”خیر دو چار دن میں پھاگی جاتا رہا۔ ایک دوپہر اس کے ہاں بھی گزاری۔ اس کا باپ باہر گھاس کاٹنے گیا تھا۔ ماں اندر بیمار پڑی تھی۔ اس کا اک نخا سا بھائی اپنے ہم جلوں کے ہمراہ پر لے سرے پر گلی ڈنڈا کھیل رہا تھا۔ چھپر کے نیچے اس نے میرے لیے چار پانی بچھا دی۔ پانی لے آئی۔ حق تازہ کر دیا! اور اندر ماں کے پاس چلی گئی۔ میں آنکھیں بند کئے لیٹا رہا۔ اچانک میرے کانوں میں کپڑوں کی سرسری اہٹ کی آواز آئی۔ مر کر دیکھا تو وہ دودھ کا ایک پیالہ لیے کھڑی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا ہے؟“
کہنے لگی۔ ”دودھ ہے پی جائے۔ آپ نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ بھوک ہو گئی آپ کو؟“

اس کے بعد میں نے اسے کچھ ایسی نظر دی۔ دیکھا کہ اس کے ہاتھ سے پیالہ چھوٹ کر میری چھاتی پر گر گیا اور تمام دودھ میرے کپڑوں میں جذب ہو گیا۔ وہ جھینپ سی گئی۔ میں نے کہا۔ ”کوئی بات نہیں، ایسا ہوتی جاتا ہے۔“
وہ بولی۔ ”پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔ صرف آپ کے سامنے ایسا ہو گیا۔“

میں اس کا مطلب سمجھ گیا اور اس وقتنے میں جو باتیں ہم نے خاموشی ہی خاموشی میں ایک دوسرے کو سمجھا گیں، ان کا ذکر میرے لیے تکلیف دہ ہو گا۔ مختصر یہ کہ ہم ایک ایسی بلندی پر جا پہنچے جہاں زبان کا کام آنکھوں سے لیا جاتا ہے۔“

دوسرے دن ہمارے گاؤں میں فوجی بھرتی کرنے والا صاحب آیا۔ باپ نے مجھے بھی پیش کیا۔ گورا چٹا جوان تو میں تھا ہی صاحب نے جھٹ پٹھی لکھ دی اور کہا کہ آج ہی تم کو بات چھاؤ نی کروانے ہو جاؤ۔ میں نے سوچا پھاگی کیسے جاؤں گا! اور کافی دیر سوچتا

رہا۔ اور آخر مجھے اسٹیشن کی طرف روانہ کر دیا گیا اور جب میں نے ریل کے ڈبے میں بیٹھ کر یہ گیت گایا تو اچھے بزرگ مسافروں کی ڈاڑھیاں بھیگ گئیں۔
بوڑھا گانے لگا۔

”جب چڑیا دان و لگا چنے گھونسلے سے نکلتی ہے تو اس کے ہمراہ اس کا محبوب ضرور ہوتا ہے!
دو شیزائیں کنوں پر پانی لینے ہمیشہ اکٹھی جایا کرتی ہیں!
چاند کے ساتھ ایک تار اتم نے اکٹھ دیکھا ہوگا!

جی ران آن گھوں والی میری پیاری حور! تو پھولوں میں سوئی ہوئی کون سے خواب دیکھ رہی ہے!
میں لڑائی پر جا رہا ہوں۔ شاید ہی واپس آؤں!
ہوا! ذرا ساجن کے دلیں کو جانا اور اسے میرا حال سنانا!
باولو! اپنا رخ ذرا پورب کی طرف پھیر لو اور میرے ساجن کے سر پر جابر سوا!
سورج! اپنی نازک کھلنڈری کرنوں کو حکم دے کہ جی ران آن گھوں والی میرے پیاری حور کے پاس میرے آنسوؤں کی مالے
جا گیں!

میں لڑائی پر جا رہا ہوں۔ شاید ہی پھر واپس آؤں!

بوڑھا گا رہا تھا۔ پاس ہی دو گھریاں اپنی لمبی دموں کے بال کھڑے کیے، تختی تختی مضطرب آنکھوں سے بوڑھے کی لہراتی ہوئی آواز کو جیسے دیکھ رہی تھیں! اس کی آواز نے کائنات کو گھیر لیا تھا! گیت کی سحر انگیز لے کے اثر سے میں زور زور سے سانس لینے لگا!
میں نے اس وقفے میں بہت سے خواب دیکھے۔ سنہرے حاشیوں والے دھندے دھندے خواب جو آسمانوں اور زمین کے بے پایاں خلا میں دھڑک رہے تھے! آواز کے سنہری دھانگے میرے تصورات کو اپنے اندر لپیٹ کر اور پرانے جا رہے تھے۔ اور پا جانے کس دلیں کی طرف!

”آپ کیا سوچ رہے ہیں ملک جی؟“
میں چونک اٹھا۔

آپ تھک گئے ہیں شاید!

”نہیں بابا! میں تمہاری آواز میں گم تھا۔ آ گے چلو۔“

”ہاں تو ملک جی! ان دنوں بڑی لام شروع ہونے والی تھی۔ سن چودہ والی لام! میں تین سال فرانس اور مصر میں رہا۔ بڑی بڑی صیحتیں جھیلیں ملک جی! ہم پختتے تھے تو پوں کے گولے ہمارے مورچوں کے پاس آ کر گرتے تھے، بندوقوں کی گولیاں ہمارے سر کے بالوں کو چھوٹی نکل جاتی تھیں۔ کئی بار تکلینوں کی نوکوں نے ہمارے سینوں کو چھوا۔ گولیاں ہماری کھال اڑاتی منی میں وضن گئیں۔ گرد و غبار دھواں اور آگ، ہر طرف جھیل، فریادیں۔ ہم کچڑا اور پانی سے بھرے ہوئے مورچوں میں دو دو راتیں، چار چار راتیں بیٹھے رہے سردوں کے دنوں میں! ایک روز اندر ہیرے میں میرا بھاری بوٹ ایک مردے کی کھوپڑی پر پڑا اور اس کی بڈیاں زینہ رینہ ہو گئیں۔

”ایک دفعہ میں نے ایک جرم سن پاہی کے دل میں ٹکین گھونپ دی۔ وہ بے تاب ہو کر گرا اور بڑی مشکل سے اپنی جیب میں سے بھرے بھرے گالوں اور سنبرے ٹھنگھریاں ہمارے بالوں والی ایک خوبصورت بھوی بھالی لڑکی کی تصویر نکال کر اسے چوما، پہنچی لی اور مر گیا! ملک جی! میں نے اس پاہی کو اپنے ہاتھوں سے دفن کیا اور دفن کرتے وقت تصویر اس کے زخمی دل پر رکھ دی۔

”کسی کو جان سے مار دینا ان دنوں ہمارا روز کا کھیل تھا۔ میں نے ان گنہگار ہاتھوں سے کئی سو آدمی جان سے مارے ہیں ملک جی! لیکن اس پاہی کو قتل کر کے میں نے محروس کیا کہ میرے زخم چھل کے ہیں۔ میں دنیا کا سب سے بڑا گنہگار ہوں۔

”ای دن بے خبری میں میں اپنے مورچے کے کنارے بیٹھا اپنی چراگا ہوں کے خواب دیکھ رہا تھا کہ جرم کیپ کی طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ میرے کئی ساتھ رکھے۔ میرا بایاں بازو بری طرح زخمی ہوا۔ درد کی شدت سے میں بے ہوش ہو گیا۔ ہم زخمیوں کو ولایت بھیج دیا گیا۔ ایک سال برٹین نامی شہر میں رہتا پڑا۔ بڑا خوبصورت شہر تھا ملک جی! آخر میرا بازو کاٹ دیا گیا اور مجھے پشن دے دی گئی!

”جب ہمارا جہاز کراچی پہنچا تو میں پہلی گاڑی سے گھر روان ہوا۔ اشیش سے اتر کر اپنے گاؤں آیا۔ لوگ مجھے پہچانتے ہی نہ تھے۔ آخر مجبوراً میں نے انہیں نام بتایا۔ انہوں نے کہا کہ ایک سال ہوا ہم تمہارا ماتم بھی کر چکے ہیں۔ کسی ساہی نے انہیں لکھا تھا کہ میں لا رائی میں زخمی ہو کر مر گیا ہوں اور میری لاش ولایت بھیج دی گئی ہے۔ لاش ولایت کیوں بھیج دی گئی۔ یہ انہیں معلوم نہ تھا۔

”میں نے پوچھا۔ ”اور میرے ماں باپ؟“

انہوں نے بتایا کہ بے چارے پہلے سال بیٹھے کی وبا میں مر گئے

میں روتا رہا گھر آیا۔ ویران اور سنسان دیواروں پر گھاس چاروں طرف ہولناک خاموشی جنات کا مسکن!
”تمام شہر جمع ہو گیا۔ ہماری زمینیں تو بہت تھیں۔ ابھی تک وارثوں نے تقسیم نہ کی تھیں۔ میں وقت پر پہنچ گیا تو میرے رشتہداروں کے لکھے جل گئے!

”دوسرے دن میں نے پھاگی کی راہ لی۔ گاؤں کے چھٹ کے پاس پہنچا تو دور سے اس لڑکی کو آتا دیکھ لیا۔ راستے میں ایک جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ وہ میرے پاس سے گزر گئی۔ اس کا شباب بہار پر تھا۔ میں نے چاہا کہ زور سے چینوں اور اسے اپنے پاس بلا کر ایک ایسا گیت سناؤں جس سے وہ مدھوں کر میرے زانوؤں پر سر کھو دے۔ وہ پانی بھر کر میرے پاس سے گزری۔ میری نظریں اچانک اس کے کانوں پر گز گئیں۔

”ان میں چاندی کے بندوں کی بجائے سونے کی بالیاں تھیں! اس کی شادی ہو چکی تھی!

”میرے کئے ہوئے بازو میں ایک ٹیس سے انھیں سے ٹکھا۔ میں گھبرا سا گیا! ادھرا ڈھردیکھا! جی چاہا بھاگ جاؤں۔ اس بچاری کی زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ لیکن میں ضبط نہ کر سکا۔ میں نے کہا۔ ”لڑکی! ذرا بات سننا!”

”وہ رک گئی۔ گھور کر مجھے دیکھا۔ گھڑے اک طرف رکھ دیئے اور میرے نزدیک آگئی۔

”وہ میرے سامنے خاموش کھڑی ہو گئی۔ پہلے تو اس کی آنکھیں میرے کئے ہوئے بازو پر جم گئیں، پھر میرے چہرے پر! وہ اتنی روئی، اتنی روئی کہ میں نے آج تک کسی انسان کو اس قدر روتے نہیں دیکھا۔ لیکن اس کی آوازنہ لکھی۔ اس کے ہونٹ پھر کتے رہے۔ نازک نخنے لرزتے رہے! گلابی رخساروں کا رنگ پہلے زردی اور پھر نیلا ہٹ میں بدل گیا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں دیر تک نہ ہٹھیں!

آخراں نے پوچھا۔ ”تم زندہ ہو؟“

میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ہاں“

”وہ پھر خاموش ہو گئی۔

”میں نے کہا۔ جاؤ، تمہیں دیر ہو رہی ہے اور گاؤں سے کچھ لے کیاں بھی پانی بھرنے ادھرا رہی ہیں۔ تم جاؤ، تمہارا شوہر انتظار کر رہا ہو گا!“

وہ بچھوٹ پچھوٹ کر رونے لگی۔ ”مجھے معلوم نہ تھا۔ خدا کی قسم مجھے معلوم نہ تھا۔ لوگوں نے کہا تم مر گئے ہو اور پھر لڑکی گھر کا سب

سے زیادہ مکین مال ہوتی ہے۔ ماں باپ نے مجھے ایک بد بخت بیمار شخص سے بیاہ دیا۔ اب میں کیا کروں؟ مجھے کوئی طریقہ بتاؤ۔ خدا کے لیے مجھے کوئی طریقہ بتاؤ۔“

”اس کا سارا جسم بے طرح کانپ رہا تھا۔ اگر میں اسے سہارا نہ دیتا تو شاید وہ گر پڑتی!“

بوڑھا یہاں پہنچ کر خاموش ہو گیا اور میں نے دیکھا کہ اس کی بوڑھی آنکھوں میں ایک ایسی چمک ہے جو اکثر کسی بہت بڑے حادثے کی یاد سے پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ وہ اپنے آپ جو جھونک کر کہنے لگا۔ ”میں اس کی زندگی کو تلخ ہوتے نہ دیکھ سکتا تھا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ تقدیر نے ہمارا ساتھ نہیں دیا۔ میں تمہیں یختے دو یختے کے بعد عمل جایا کروں گا۔ اب مجھے تم صرف ایک شناسا تصویر کیا کرو ورنہ تم بہت دیر تک زندہ نہ رہ سکو گی۔“

ہم دونوں اکثر اس جھاڑی کے پاس یا اور کہیں ملتے رہے لیکن ہماری ملاقاتیں دنیا سے زراں تھیں۔ میں اسے لڑائی کے حالات سنا تھا اور وہ روتوں تھی۔ جی تو میرا بھی چاہتا تھا کہ روئے جاؤں مگر مجھے اس کی تسلی اور اس کا اطمینان منظور تھا۔

”دنیا کو ہمارے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ پندرہ سال یوں ہی گزر گئے۔ اس کا خاوند ایک سال پہلے مر چکا تھا۔ دوسرے سال وہ دوون یہاں رہی اور اچانک چل بسی۔

”آخرون گوں کو ہمارے تعلقات کا علم ہو گیا کیونکہ میں نے اپنی ساری زمینیں بیچ کر پھانگی کی شہزادی کے مزار پر ایک روضہ تعمیر کرایا۔ آپ نے پھانگی کے پنچھت کے پاس ایک بڑے گنبد والا روضہ نہیں دیکھا۔“

بوڑھے نے اس موقعے پر بالکل آنسو نہ گرانے بلکہ ایک گیت گانے کے لیے گلاصاف کیا۔

میں نے پوچھا۔ ”مگر یہ نیل وغیرہ کس کے ہیں بابا؟“

”پھانگی کی شہزادی کے بچوں کی پروردش میں نے اپنے ذمے لے لی ہے۔ گاہیں چڑا کر دودھ بیچتا ہوں اور انہیں کھلاتا ہوں۔ کیا یہ سب سے بڑی عبادت نہیں ملک جی؟“

اس کے بعد وہ اٹھا۔ چادر جھاڑ کر کامنے ہے پر رکھ لی۔ میرے ساتھ ادب سے مصروف کیا۔ گاہیں اکٹھی کر کے آگے لگالیں اور یہ گیت (کھوڑہ تحصیل خوشاب ضلع سرگودھا کے ایک مشہور شاعر علی کے دوہے کا لفظی ترجمہ) گاتا پھانگی کی طرف چلا گیا۔

”آنکھوں نے رونے کی رسم شروع کی ہے جب سے میرا ساجن پر دیس و سدھار گیا!

”تقدیر نے تدبیر کو تکست دے دی۔ خدا نے مجھے ساجن کی بے پایاں محبت و دیعت کر رکھی تھی!

”میں ہولناک سمندروں کو پیرتا ہوا بہاں جا پہنچا جہاں غموں کا گھٹاؤپ اندھیرا تھا!

تقدیر نے میر کو تھکت دے دی۔ خدا نے مجھے ساجن کی بے پایاں محبت دویعت کر کھی تھی!

”میں ہولناک سمندروں کو پیرتا ہوا بہاں جا پہنچا جہاں غموں کا گھٹاؤپ اندھیرا تھا!

”اے علی! میں نے بڑے شوق سے روزے رکھے لیکن آخر چاند بدیوں میں چھپ گیا۔ شاید عید میرے نصیبوں میں نہ تھی!“



نھاما نجھی

کشتی کنارے سے لگی ہی تھی کہ نھاما لاح اچھل کر میرے قریب آیا اور میرے گھٹنوں پر سر رکھ کر رونے لگا۔ ”آج تو آپ میرے مہمان رہیں۔ خدا کے لیے بابو جی! رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے! آج رات میری جھونپڑی میں گزاریے۔ میر ابوڑھا باب آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہو گا بابو جی! آپ ایک دن بھی نہیں نکال سکتے؟ اپنے غلام کے لیے آپ ایک دن بھی نہیں نکال سکتے؟ میں بھی شہر جا کر گوشت لے آؤں گا۔ آپ.....“

نخے ماٹھجھی کی یہ فریاد اس معموم دل کی گہرا بیوں سے نکلی تھی جس نے اس دنیا میں آ کر پانی اور صرف پانی ایسی مصفا چیز سے تعلق پیدا کیا تھا۔ جس نے اس کے کے غیظاً بھیڑوں سے بے خبر ہو کر ایک ایسی پاکیزہ فضا میں پرورش پائی تھی جس میں کسی چیز کو محبت سے دیکھنا جرم نہیں سمجھا جاتا۔

نخے ماٹھجھی کو میں دوسال سے جانتا تھا۔ میں میں میں ایک بار مجھے ضرور ریا پار جانا پڑتا تھا، اس لیے مجھے اس لڑکے سے اس قدر انس ہو گیا تھا کہ صرف اس کی کشتی پر سوار ہونے کی غرض سے اس کے انتظار میں میں نے کئی راتیں خنک ساحل پر گزار دی تھیں۔ بوڑھے ملاح مجھے سر پھرا سکھنے لگے۔ سافر مجھے بے کار نوجوان کہنے لگے لیکن مجھے اس لڑکے کی تختی کشتی پرانے چپو اور دمکتی ہوئی معموم آنکھیں یاد آ جاتیں اور میں آرام سے پاؤں پھیلائے نیلگلوں آسمان کی وحتوں میں نگاہیں دوزاتا رہتا اور آخر نخے ماٹھجھی کے کالے چپوؤں کی مت چپ شپ سے چونک اٹھتا۔

وہ مجھے دیکھ کر بے اختیار ہستا اور جب کشتی کو باندھ کر میرے پاس آتا تو اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوتیں۔ وہ میرے سامنے بولنے کی کوشش کرتا لیکن احساسات کے طوفان سے اس کی زبان گنگ ہو جاتی۔ وہ صرف ہنس دیتا اور خوشی کے آنسو اس کے سانوں لے رخساروں پر تھرکتے ہوئے نیچے گلی ریت میں کھو جاتے!

میں اسے ہمیشہ مقررہ نرخ سے دگنی تھگی رقم دے دیا کرتا تھا اور ہر مہینے شہر سے اس کے لیے کوئی نہ کوئی تخفہ ضرور لے آتا۔ اب کے میں اس کے بوڑھے باپ کے لیے سات گز کی گلابی گپڑی لے آیا۔ جسے دیکھ کر اس کی شفاف آنکھیں اور زیادہ چکنے لگیں!

”بابو جی! اگر آج آپ میرے گھرنہ آئے تو میں کشتی چلانا ہی چھوڑ دوں گا۔“

نئے مجھی نے آسمیں سے آنسو پوچھے اور میرا سوت کیس سر پر کہ کر ایک طرف چل پڑا۔ مجھے اس دن دفتر میں حاضر ہونا تھا۔ میں نے اسے ہر ممکن طریق سے سمجھایا کہ ”بھائی میں تو کری سے برخاست ہو جاؤں گا۔ مجھ پر جرم ان ہو جائے گا۔ وہ مجھے پھر ادھرنہ آنے دیں گے۔“ لیکن اول تو وہ ان شہری اصطلاحات کو سمجھنے سے قاصر تھا اور اگر اس کے مخصوص دل میں ان خطرات کا کچھ احساس پیدا بھی ہوتا تو اچانک مت جاتا اور وہ اپنے ضعیف باپ کا واسطہ دے کر مجھ سے کہتا کہ آج ضرور میرے مہمان بننے۔ مجبوراً میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا گیا اور وہ ایک نہایت لذیذ تقریر کرنے میں مصروف رہا۔

”بابو جی! وہ سامنے وہندی ہے نا؟..... اسی میں ہماری جھونپڑی ہے۔ میرا باپ بہت بوڑھا ہو گیا ہے۔ اس کے بال آٹے کی طرف سفید ہو گئے ہیں۔ وہ کھانا کھاتا ہے تو ایک ایک لقمه چبانے میں بہت وقت لگادیتا ہے، پھر بھی چبانیں سکتا بابو جی! ہم نے ایک بکری پال رکھی ہے، میں جا کر اس کا دودھ دو ہوں گا، پھر اس میں روٹی بھگو کر باپ کو کھلاوں گا۔ وہ میرا انتظار کر رہا ہو گا، جھونپڑی کے دروازے پر یا اندر کھاث پر، جو چیز اس پکڑنڈی سے گزرتی دکھائی دے گی وہ اسے دیکھ کر سمجھے گا کہ میرا نخا آگیا۔

”رات کو میں اس کے پاؤں و باتا ہوں، لیکن بابو جی! بدیاں دبانے سے آرام کیا ملتا ہو گا۔ بابو جی ایک دن میری کشتی میں ایک لاش ڈال دی گئی۔ مجھ سے کہا کہ اس پارے چلو۔ میں نے کنارے پر پہنچ کر اس کے منہ سے کپڑا ہٹایا تو وہ ایک بوڑھا سفید بھنوؤں والا بزرگ تھا۔ میں نے اس کے رشتداروں سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ اپنے بیٹے کی شادی پر جاتے ہوئے راتے ہی میں مر گیا ہے چارہ!“

”بابو جی! اس دن سے مجھے بھی یہ خیال آتا رہتا ہے کہ کسی دن اگر میرا باپ بھی مر گیا تو میں کیا کروں گا؟ پھر مجھے چپو چلانے اور ماہیا گانے میں کچھ لطف نہ آئے گا بابو جی۔ اپنی ماں تو میں نے دیکھی ہی نہیں۔ میرے پچھنے ہی میں سدھار گئی۔ باپ کہتا ہے کہ وہ بہت اچھی تھی۔ دریا کنارے اس کی قبر ہے۔ میں اکثر وہاں جا کر اس پر اگی ہوئی گھاس توڑ توڑ کر کھایا کرتا ہوں۔ اور بابو جی اس گھاس میں سرخ سرخ ٹیروں اور سفید سفید ٹوٹوں سے زیادہ محسوس ہوتی ہے۔“

اس نے پہلی مرتبہ میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے ماں باپ جیتے ہیں بابو جی؟“

”باپ تو مر گیا ہے مانگھی! ماں زندہ ہے، تمہارے باپ کی طرح بوڑھی ہے۔“

”اللہ کرے جیتی رہے آپ کی ماں۔ اپ بھی دعا کریں کہ خدا کرے میرا باپ بہت دیر تک جیتا رہے۔ بابو جی! ہمارا خدا آسمانوں پر رہتا ہے نا؟“

پھوں کا خیالِ خدا کی طرف ہو جائے تو وہ عجیب عجیب نکلتے رکھتے ہیں۔ اس لیے میں نے جواب دیا ”ہاں!“
پھر اس نے ذرا رُک کر پوچھا۔ ”اور اپنے بندوں کو زمین پر پھینک دیا؟“
”ہاں وہ سب سے اعلیٰ سب سے اونچا ہے۔ اسے اونچا ہی رہنا چاہیے۔“

”انسان کو زمین پر بھیج کر پھرو اپس کیوں بلا لیتا ہے؟“

”نہ بلائے تو یہ دنیا جلدی ہی پرانی ہو جائے ماجھی۔“

اس جواب سے اس کی تسلی ہو گئی۔

چلتے چلتے وہ کئی جگہ بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑا اور جب میں نے اس سے اس کی وجہ پوچھی تو بولا۔ ”بابو جی! جی چاہتا ہے آج تو ہستا ہی جاؤں۔ آج تو میرے لیے عید ہو گئی۔ میرا بابا تو خوشی سے رو رہے گا۔ بابو جی! ہمارے ہاں آپ جیسے لوگ کب آتے ہیں؟“
میں حیران تھا کہ ماجھی کی اس بے پناہ محبت کا بدله کیسے اتنا روں گا؟ یہ تو میری پوچھا کرتا ہے! میں سوچتا گیا کہ اس کا باپ مجھے دیکھ کر مرست سے کاپنے گا۔ جھک کر میرے ساتھ مصافحہ کرے گا۔ مجھے چار پائی پر بٹھائے گا۔ خود دیوار سے پیٹھے لگا کر زمین ہی پر بیٹھ جائے گا۔ ماجھی کو قبھے سے گوشت اور سوچی لانے کو کہے گا اور پھر شام کو ہم تینوں اکٹھا کھانا کھائیں گے۔ غریبوں کا مہمان بننے میں جو لذت ہے وہ امیروں کے مہمان بننے میں کہاں! غریبوں کے ہاں سادگی، اخلاص اور حقیقی سرست! اگر ساری دنیا غریب ہوتی، ساری دنیا کی معاشرت کا معیار اس نئے ماجھی کے باپ کا سا ہوتا، تو کتنی خوش قسمت ہوتی یہ کائنات! یہ زہر لی گیس، یہ بجلیاں برساتے ہوئے ہوائی بھوت، یہ آگ اگلنے والی آہنی ڈائیں، یہ کلیجے بھونتی ہوئی چمکدار نالیاں، یہ گرد نیس اڑاتی ہوئی تکواریں، یہ رگیں کامنے ہوئے نیزے، یہ سب نا بود ہوتے! سادگی کی میٹھی میٹھی پھواریں، سکون و اطمینان کے خنک ولطیف جھوٹکے! زندگیاں فطرت کی ہلکی چکیبوں، دھیمے دھیمے ملکوروں سے لطف اندوڑ ہوتیں۔ اور پھر، پھر انسان ہمیشہ جینے کی خواہش کرنے میں حق بجانب ہوتا! لیکن اب اب تو!

ماجھی کی آواز آئی۔ ”بابو جی!“

میرا سلسلہ خیالات ٹوٹ گیا۔ ہوائی قلعے ریزہ ریزہ ہو کر بھر گئے۔

”بابو جی! وہ ہے ہماری جھوپڑی! دیکھی آپ نے؟ بولوں میں پھنسنی ہوئی۔ وہ جس کی دیوار کا ایک حصہ گر چکا ہے!... ہاں وہی!“

دروازہ کھلا تھا۔ دروازے کے ساتھ ایک بکری بندھی تھے جو گردن اٹھائے شاید ماٹھی ہی کی مختصر تھی۔ اس کے پاؤں میں زیادہ تیزی آگئی۔ وہ دوڑتا ہوا پاں پہنچ جاتا مگر مجھے مذکور دیکھتا اور فقار کم کر لیتا تھا۔ وہ آج کتنا خوش تھا۔ کشتی سے اتر کر جھوپڑی تک آنے کے دوران میں اس کے مخصوص بوس کے کانپتے ہوئے گوشے کھلے ہی رہے، اس کی آنکھیں مسکراتی ہی رہیں! اس کے نعلے ہوتے اور ٹھوڑی کے درمیان پینے کے دو چار قطرے شاید شدت احساس کا ثبوت پیش کر رہے تھے۔ بکری اسے دیکھ کر زور زور سے میاں!

اس نے سوت کیس دیوار کے ساتھ رکھ دیا اور بھاگ کر اندر گیا۔

”باپو..... باپو..... باپو جی..... باپو..... باپو!“

میں اندر گیا۔ بوڑھا سورہ تھا۔

”سو نے دو ماٹھی! آرام کرنے دو۔“

”لیکن باپو جی! باپو اس وقت پہلے تو کبھی نہیں سویا کرتا تھا!“

جب میں نے نبض پر ہاتھ رکھا تو سامنے دیوار کے شگاف مجھے گھورنے لگے! میری آنکھوں میں آنسو منڈ آئے۔ میں نے کانپ کر ماٹھی کی طرف دیکھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر زور سے دبایا اور کہا۔ ”آپ روکیوں رہے ہیں؟“
یہ کہہ کر وہ بھی رو نے لگا!

میں نے اسے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا باپو چل بسا۔“

وہ پوری قوت سے میرے بازوؤں کی گرفت سے چھوٹ کر اپنے باپ پر جا گرا۔ اس کی لاش کو چھپ چھپ کر جھنجوڑا۔ اس کی آنکھیں کھول کھول کر دیکھیں۔ اس کا سراہٹا اٹھا کر بڑا یا۔ چار پائی کے پا یوں سے اپنا سر نکلا اٹھا کر ماٹھا خی کر لیا۔
میں نے کہا۔ ”ماٹھی..... بہت نہ روو۔“

لیکن اس نے مجھے ایسی نظروں سے گھورا۔ جیسے ساری دنیا میں ایک میں تھی اس کا دشمن ہوں، میں نے سمجھا۔ اس کی وہڑتی ہوئی آنکھوں سے اس کی روح نکل کر مجھے دبوچ لے گی! نئھے ماٹھی کی محبت اب بوڑھے ”باپو“ کی تختنڈی اور اکڑی ہوئی لاش پر مرکوز ہو چکی تھی! وہ باپو کو بھول گیا تھا۔

ماٹھی کو اب میں اپنے گھر لے آیا ہوں لیکن کشتی چلانے یا مجھ سے با تین کرنے کے بجائے اب وہ ایک کمرے میں پڑا میری لائی ہوئی سات گز کی گلابی گپڑی کو گھورتا رہتا ہے۔“



ہرجائی

ب عمرات کے دن مجھے اس کھیت کو ہاتھ لگا نا تھا جو ریل کی پڑی کے ساتھ ساتھ بہت دور تک چلا گیا ہے۔ گاڑی کی ہر وقت کی آمد و رفت سے مجھے ہاروں کا دل وہاں قدر تباہ لہار جاتا ہے۔

میں بدھ کو سویا تو آدمی رات کوہی آنکھ کھل گئی۔ کروٹیں بد لیں، آنکھیں زور زور سے بھینجیں، انہوں بیٹھا لیت گیا، مجھے چھاتی سے لگائے، پاؤں پھیلا دیئے گئے نیند عنقا تھی۔ یہ نیند کیا چیز ہے؟ میں نے سوچا، یہی کون، اطمینان قلب۔ لیکن رونے والے بھی تو سوجاتے ہیں۔ پھر نیند کیا ہے؟ انہی الجنوں میں مشرق سے پوچھنے کے آثار نمودار ہوئے۔ ایک موہوم سادھند لکا افق کے ساتھ ساتھ ابھرتا معلوم ہوا۔ میں نے درانقی باتھیں لی رہی کرے جیئی پانی کا پیالہ پیا اور وہ تھانی گیت گتگنا تاہوا ہولے سے گاؤں کے باہر نکل گیا۔ اوس سے بھیگے ہوئے پوڈے یوں بھکے ہوئے تھے جیسے مراثی میں ہیں۔ گھاس لکھری لکھری تھی۔ نم آلو دمنی کی بھینی بھین خوشبو سے دماغ نئے نئے بہشت ایجاد کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ مستقبل کی تاریکیاں خیالی سرت کی بلکل بلکل کرنوں سے آہستہ آہستہ دور ہوتی جا رہی ہیں۔ آسمان کی لا محدود و دوسرت افق کی لامتناہی لکیری بزرہ زاروں کا بے پناہ پھیلا دا۔ میری پھر پھر اتنی ہوئی مضطرب اور بے قرار روح کے لیے جس ثابت ہو رہے تھے۔ میں کہیں اڑ جانا چاہتا تھا۔ سامنے شفق کی بوقلمون رنگوں والی آسمانی وادیوں میں سما جانا چاہتا تھا۔ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مسکرانا چاہتا تھا اور غم.....؟

غم مجھے انسانی زندگی کے کلیچے میں ایک کائنے کی طرح معلوم ہو رہا تھا اور یہ غم کھانے والے لوگ! مسروں اور بشاشوں کے سہرے صفحوں پر بدنداہ ہے، رہمان اور ارضی خلد زاروں کے شفاف ما تھوں پر کنک کے ٹیکے! یہ لوگ جینے کے قابل ہی نہیں میں سوچ رہا تھا وہ کھیت جن میں اگے ہوئے پوڈوں کے زرد خوشے سریبوڑائے زمیں کو دیکھ رہے تھے، وہ درخت جن کی تلک بوس چوٹیوں پر چیلوں کے گھونسلے مند کھولے آسمانوں کو گھور رہے تھے، وہ بیل کھاتی ہوئی پگڈنڈیاں جن کی چھاتیاں صدیوں سے رومندے جانے کے باوجود ابھری ہوئی تھیں۔ میری سرت کی ٹھکلیوں اور میرے جذبہ انبساط کی آسمان پیاسیوں کے لیے یہ دنیا! کوئی اور دنیا چاہیے تھی میرے لیے کوئی نئی دنیا جہاں رنگ ہوتے، راگ ہوتے، حسن ہوتا، عشق ہوتا، شاد کام عشق یہ تلخ کام عشق نہیں جس کی قسم میں آنسوؤں اور آہوں کے سوا کچھ نہیں

میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے درانتی سے دس بارہ پودے کاٹ کر دور پھینک دیئے، سبزے کونوچ کر ہوا میں اڑا دیا۔ پگڈنڈی کو چھوڑ کر چلنے لگا۔ گھونسلوں پر پتھر پھینکے۔ چیلیں، پھر پھر زانی ہوئی وہندلی فضا میں تیرنے لگیں اور میں خوشی سے ناچتا کو دتاریل کی پھری کے قریب ہوتا گیا۔

کھیت کے پاس پہنچ کر میں نے کمر سے ری کھولی لے بالوں پر ہاتھ پھیرا درانتی کے چکتے ہوئے دندانوں کی طرف دیکھا اور یہ گیت الاپتے ہوئے جوار کائے گا۔

”اساں نال سجن دے لائیاں اکھیاں رنگ بھریاں“

بزر رنگ کے نخے نخے کیڑے پتوں کے ساتھ چھٹے تھے۔ بھیگی بھیگی زمین پر عجیب الخلق تیزیں ریگ رہی تھیں۔ یک ایک میرے کانوں میں گاڑی کی سیٹی کی آواز آئی۔ میں نے ہاتھ روک لیا اور انٹھ کرا دھرا دھر دیکھا۔ مغرب کی طرف افق کے پاس دھوکیں کا ایک مرغولہ ہوا میں مل کھاتا معلوم ہوا اور پھر کالے کالے انجمن کی ابھری ہوئی چھاتی ماتھے میں ایک سفید چمکتی ہوئی آنکھ، ہوا میں لبراتی ہوئی زلفیں، زمانہ قدیم کی داستانوں کا دیو جوز میں کے سینے کو لٹڑتا دھاڑتا ہوا بڑھا آرہا تھا! دھم دھپ! دھم دھپ..... گاڑی بہت نزدیک آگئی۔ ڈرائیور نے اپنا سر باہر نکالا۔ کلامنہ سفید دانت اڑتے ہوئے بال اور میلے ہاتھ۔ پھر چکڑے ایک اگریز، ایک میم چھاتی کے ساتھ کتا گائے اور پھر ایک ہندوستانی صاحب، موٹا سا گارڈ بُوڑھی خاتون، اخبار کا پھر پھر زانتا ہوا پر چاہ اور پھر ایک دہقان پاس ہی کا نپتا ہوا حصہ ایک دہقانی عورت دو پہنچے۔ میری نظر نہ جم سکی۔ یک ایک میرے پاس آم کی ایک گھٹھلی آگری اور پھر ایک کمرے میں ایک بچہ سفید بآہوں کی طرف بھاگتا معلوم ہوا۔ میرے ساتھ مذاق کیا تھا شریر نے یہ میل بھی کیا ایجاد ہے ولایت والوں کی! پل بھر میں دھوکیں کے سوا اور کوئی نشان نہ تھا۔ میں سوچنے لگا۔ یہ صاحب لوگ اور یہ ہندوستانی بزرگ اور یہ دہقان یا اکٹھے ایک کمرے میں کیوں نہ بیٹھے، دہقان بھی انسان تھا آخروہ نرم گدیلوں اور مختنڈے مختنڈے پنگھوں کے نیچے کیوں نہ بیٹھے سکا؟ صاب کو بدبو آتی ہے اس کے کپڑوں سے؟ کیا صاحب کو متugen شراب، غلیظ سگار اور بدبو دار سگرٹ سے نفرت نہیں ہوتی؟ نہیں! انسانوں کو انسانوں سے نفرت کیوں ہے؟ دہقان کے پاس پیرس نہیں اور صاحب کی جیب میں چاندی ہے۔ پیرس! پیسے کی دنیا! مگر مجھے کیا..... مجھے کیا؟ میں نے سوچا..... آخر مجھے کیا؟ میں درانتی ہاتھ میں گھما تا ہوا کھیت کی جانب بڑھا۔

ایک بار یک سی آواز آئی۔ ”او بھائی!“

میں نے پلت کر پھری کے اس پار دیکھا، کچھ نظر نہ آیا۔ ”مجھے کس نے بلا یا تھا؟“

ادھر بائی، ادھر آنڈا۔“

سامنے کھیت سے ایک لڑکی کا سر محمود اور ہوا۔ سرخلا تھا اور رنگ تھا۔ بس۔ دوری کی وجہ سے میں اور کچھ نہ دیکھ سکا۔ میں نے درانتی کٹی ہوئی جوار پر چینک دی اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا پہڑی کو عبور کر کے کھیت کی جانب بڑھا۔ لڑکی جوار کو رسی سے باندھ رہی تھی۔ اس کوشش میں اس کے کالے بال جن میں سنہری رنگ کی ہلکی ہلکتی تھی، جوار کے شبنم آلوں پتوں کو چھوڑ رہے تھے۔ کالا کرتا اور کالا تہبند۔ میرے دل میں کوئی خیال نہ آیا۔ کوئی چھمن نہ تھی۔ ایسے واقعات مجھے کئی بار پیش آچکے تھے۔ جوار اٹھا کر اس کے سر پر رکھنی ہو گی۔ ایک لڑکے سے اسے اور کیا کام ہو سکتا ہے؟

میں نے نزدیک جا کر پوچھا۔ ”کیا کام ہے؟“

لڑکی نے سراخھاتے ہوئے کہا۔ ”ذرایہ جوار میرے سر پر رکھ دو۔“

وہ کتنی خوش گوار گھڑی تھی جب میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ ابھرنا ہوا ماتھا، تیکھی ناک، نازک نازک، باریک باریک، سرخ سرخ لب، بلوں کے گوشوں پر بہت ہی خفیہ سیاہی اور آنکھیں؟ جیسے ان میں سے روشنیوں کے جیسے چھلک پڑیں گے۔ انجوں بھر میزھی اور گھنی پلکیں، نخلے ہوتے کے عین نیچے کھجی ہوئی ٹھوڑی کے حسین گڑھے کے کنارے پر ایک گول سیاہ تل۔ وہ مسکراتی اور اس کے چہرے پر گول لہروں کے خفیہ نشانات ابھر آئے۔

”کیا ہاتھ بٹاؤ گے میرا؟“

مجھے اس وقت معلوم ہوا کہ میں ایک لڑکی کو دیوانوں کی طرح گھور رہوں۔ میں نے اپنے جسم کو جھکا دیتے ہوئے کہا۔ ”ضرور“ میرے تمام جسم کو نیندی آگئی تھی۔ میں نے جوار پر ہاتھ رکھا۔ بازوں کی طاقت کدھر گئی تھی؟ شرمندہ نہ ہونا پڑے اس لڑکی کے سامنے! میں نے بالوں پر ہاتھ پھیرا، گلا صاف کیا اور پھر جھکا، لڑکی بھی جھکی۔ اس کا چہرہ جوار کے پتوں میں ڈوب گیا۔ کتنی بے پرواٹی تھی! اسے اپنے چہرے کی رعنائی کا احساس تک نہیں! اور اگر اس کے گالوں پر کوئی خراش پڑ جائے تو؟

میں نے ایک جھٹکے سے جوار اس کے سر پر رکھ دی۔ اس کے قدم دو ایک دفعہ ڈگما گئے۔ پھر وہ میری طرف دیکھ کر مسکراتی۔

”یہ درانتی بھی کہیں انکادو۔“

میں نے درانتی رسی کے ساتھ انکادی۔ وہ دو قدم چلی پھر رک کر پوچھا۔

”کہاں جاؤ گے؟“

”سامنے کوئالہ میں۔“

میں نے جواب دیا۔ ”ہاں۔“

یہ جھوٹ تھا۔ میری جوارا بھی میرے بیلوں کے لیے ناکافی تھی۔

”تو چلو مجھے بھی ادھر ہی جاتا ہے۔“

کتنا اچھا خدا! اتنا اچھا! اتنا مہربان! اور اس کی یہ پیاری زمین جس پر یہ لڑکی کھڑی تھی۔ کتنی رسیلی زمین! میں سرپت دوڑا۔ آن کی آن میں جواراٹھا کر سرپر رکھی اور لڑکی کے ساتھ چلنے لگا میرے جسم میں گرمی ہی پیدا ہو گئی تھی۔ کپٹیاں جل رہی تھیں، آنکھیں جل رہی تھیں، ہونٹ جل رہے تھے۔ یہ کیسی آگ ہے اللہ میرے ایتیزی سے اٹھتے ہوئے قدم۔ انہیں چوم لینے کو جی کیوں بے تاب ہو رہا ہے؟

اس نے پوچھا۔ ”خاص کوئالہ کے رہنے والے ہو؟“

میں نے جواب دیا۔ ”خاص کوئالہ کا۔“

باتوںی لڑکی۔ میں نے سوچا۔ لڑکیاں تو بہت کم گو ہوتی ہیں۔

دس بارہ قدم ہم دونوں خاموش رہے۔ آخر میں نے پوچھا۔ ”تمہارا گاؤں کونسا ہے؟“

”ہے تو کوئالہ ہی۔ مگر ابایا گاؤں چھوڑ کر باہر آبسا ہے۔ کیوں کہ زمینیں دور ہیں۔ وہ سامنے دو مکان نظر آ رہے ہیں تاً وہ ہمارے ہی ہیں۔“

”اچھا، تو پھر یہ مکان تو شاید راستے ہی میں پڑتے ہیں۔“

”ہاں۔ تم صبح وہیں سے گزرے تھے؟“

”ہاں۔“

”میں نے تو نہیں دیکھا تھا تمہیں۔“

”اتفاق کی بات ہے۔“

پھر خاموشی چھاگئی۔

اس نے پوچھا۔ ”کل بھی آؤ گے؟“

”روز آیا کرتا ہوں۔“

”اوھر ہی؟“

”ہاں اوھر ہی۔“

”تو میں تمہارا انتظار کیا کروں گی۔“

سرت کے جوش میں بڑی مشکل سے میرے منہ سے نکلا۔ ”اچھا۔“

میں یہ سمجھا، میرے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے ہوں میں تحرک رہے ہیں۔ یہ دنیا میرے لیے بُنی ہے۔ یہ کائنات میری ہے، میری اور اس لڑکی کی۔

اس نے پھر پوچھا۔ ”بہت تھوڑی جوار کالی ہے تم نے؟“

”ہاں۔“

”کتنے جانور ہیں؟“

”چار بیل ہیں۔“

”گائے وائے؟“

”کچھ نہیں۔“

”کیوں؟“

”ایک تھی، مر گئی تھی بے چاری پچھلے میتے۔“

دودھ چھا چھکی تو بہت تکلیف ہوتی ہو گی۔“

”بہت“

پھر خاموشی چھا گئی اور اس کا مکان قریب آیا تو اس نے میری طرف مڑ کر کہا۔ ”صحیح یہاں سے گزرتے وقت چھا چھپی جایا کر دے سمجھے؟“

میں نے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ میں آگے بڑھنا نہ چاہتا تھا بلکہ وہیں بیٹھ جانا چاہتا تھا۔ میری دنیا سست سمنا کر اس دلان میں جمع ہو گئی تھی جہاں اس نے اب جوار پھینک دی تھی، لیکن میرا اپنے آنا تو ضروری تھا۔ گاؤں سامنے تھا مگر ہر قدم پر ایک لاق و دنی صحراء کا

گمان ہوتا تھا۔ گاؤں سے نکلتے وقت جو خیالات تھے وہ یک قلم نابود ہو گئے۔ کائنات میرے لیے وضع ہو گئی۔ ہر شے میں حسن جھلکنے لگا۔ اور غم!..... غم کی چبجن سے دل کو لندت سی محسوس ہو رہی تھی۔ طبع انسانی بھی کتنی تیزی سے رنگ بدلتی ہے! اس لڑکی نے کیا قیامت ڈھاوی ہے مجھ پر؟ میں جیران تھا! اس لڑکی کی پہلی ملاقات میں مجھے حرمت کے سوا ملا ہی کیا تھا! پھر آخر میں اپنے گاؤں میں پہنچا۔ جوار تھوڑی تھوڑی کر کے ہر ایک بیتل کے آگے ڈال دی۔ وہ پیٹھ بھر کر کھانے والے سراخا کر میرا مند کیختے گئے مگر میں کھاث پر لینا اڑتی ہوئی چڑیوں کے سفید سینوں، بیری کے بزرپتوں اور سامنے دیوار میں چکتے ہوئے مٹی کے ذروں میں ایک پکر رعناء دیکھ رہا تھا۔ جس کے سر پر جوار تھی جس کی آنکھوں میں نش تھا اور زبان پر میٹھی میٹھی باتیں۔

ساری رات نیندنا آئی اور آتی بھی کیسے جب تصورات اور خیالات کے طوفان نے دماغ کی بنیاد ایں ہلا دی تھیں۔ میری آنکھوں سے دو چار آنسو بھی گرے اور جب وہ میرے رخساروں پر بہتے ہوئے میرے ہونٹوں کے کناروں پر آ کر رکے اور پھر کانوں کی طرف لڑک گئے تو میں سرت اور غم کے امتران سے مجبور ہو کر چیخنا اٹھا۔ میں نے دعا مانگی کہ الہی! یا آنسو میرے رخساروں پر بہتہ بہتے رہیں۔ میری آنکھیں بہت اٹکبار ہیں۔ میرا سینہ سدا جلتا ہے۔ مجھے بھی نیندنا آئے۔ میں مرتے دم تک جا گتار ہوں۔

اگر کوئی شخص میری یہ بات سن لیتا تو یقیناً مجھے دیوانہ کہتا لیکن میں اپنے خودا پنے خیالات سے با غنی ہو گیا تھا۔ میں صبح کو کیا تھا اور شام کو کیا ہو گیا تھا! بیچارے بیتل سوتے سوتے چونک پڑے اور میری طرف گردن اٹھا کر دیکھنے لگے۔ وہ جیران تھے کہ ہمارے مالک کو آج کیا ہو گیا ہے کہ نہ خود سوتا ہے نہ میں سونے دتا ہے کہے جا رہا ہے۔ ایک بیتل تو انٹھ بھی کھڑا ہوا۔ کان سیدھے کر کے مجھے گھورنے لگا۔ اور زور زور سے سانس لینے لگا۔ بے چارہ بے زبان دوست وہ کیا جانے محبت کیا بلا ہوتی ہے۔ محبت؟ کیا مجھے محبت ہو گئی تھی! اس لڑکی سے محبت ہو گئی تھی! یہ افسانہ بھی حقیقت بن چلا؟ اس کا ذکر تو جھوٹی داستانوں کے لیے ہی مخصوص تھا، یہ تو قصوں کا ایک جزو تھی، بھلکے ہوئے جوانوں کا ایک مشغل۔ مگر مجھے تو اس میں سچائی نظر آتی تھی۔ سچائی بے صیبی اور فرشتوں کی سی پا کیزگی!

میں گردم اٹھا، ہاتھ مند ہو یا۔ درانتی ہاتھ میں لیے بھلکی کی سی تیزی سے باہر آیا اور اڑتا ہوا لڑکی کے مکان کے قریب پہنچا۔ وہ ایک کونے سے مجھے جھاتک رہی تھی۔ وہ چہرہ! میں اپنے آپ پر رنگ کرنے لگا۔ جب میں دالان کے پاس سے گزر اتو لڑکی ایلو میسینم کا ایک پیالہ اٹھائے میری طرف آ رہی تھی۔

اس نے پیچھے مڑ کر کہا۔ ”آ گئے؟“

”اماں یہ ہے وہ لڑکا۔“

"اچھا۔"

ایک بڑھیا دودھ بلور ہی تھی۔ اس نے کہا۔ "روزانہ چھاچھ پی جایا کرو یہاں تیرا اپنا گھر ہے۔ غریب تو آپس میں بھائی بھائی ہوتے ہیں۔"

میں نے دل میں کہا۔ "اور امیر؟ امیر آپس میں دشمن ہوتے ہیں کیا! حق کہا بے بڑھیا نے واقعی دشمن ہوتے ہیں۔"

میں نے جواب دیا۔ "بہت اچھا بڑی اماں۔" پھر لڑکی کے ہاتھ سے پیالہ لے لیا۔ پہلا گھونٹ پیا۔ ہیں! یہ تو میخاتھا! کہیں دھو کا تو نہیں ہوا! دوسرا گھونٹ پیا۔ یہ بھی میخاتھا! میں نے شکریے کا اظہار کرتا چاہا مگر لڑکی کی سفید پتلی انگلی اس کے نازک ہونٹوں پر پیوست ہو گئی اور آنکھوں میں شرارت آمیز مسکرا ہٹ نمودار ہو گئی۔ میں سارا پیالہ پی گیا۔ اس کے بعد اس نے درانگی ہاتھ میں لی رہی کاندھے پر کھی اور میرے ساتھ چل پڑی۔

اس طرح پانچ دن گزر گئے!

ہم راستے میں بہت کم باتیں کرتے تھے۔ بس میں جوار اس کے سر پر رکھ دیتا وہ آگے آگے چلنے لگتی تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقٹے کے بعد وہ پوچھ لیتی تھی۔

"ماں ہے؟"

"کتنے بھائی ہو؟"

"پانی تالاب کا پینتے ہو یا کنوئیں کا؟"

"زمیں کتنی ہے؟

"گا سکتے ہو؟"

آخری سوال نے تو مجھے تذبذب میں ڈال دیا۔ یہ سوال تو اسے نہیں کرتا چاہیے تھا۔ اسے حیامانع نہ ہوئی! اور ایک دن تو اس نے مجھ سے یہ بھی پوچھ لیا۔ "جوار ختم ہو گئی تو ادھرن آیا کرو گے؟"

میں نے کہا۔ "آیا کروں گا۔"

"آیا کرنا۔"

کچھ قدم چل کر اس نے یہ الفاظ یوں کہے، جیسے میں نہیں سن رہا۔ "ضرور آیا کرنا۔"

میرا دل دھک سے تڑپا اور اچھل کر رہا گیا۔

چھٹے دن میں نے جوار کاٹ کر پھر دی کے اس پار دیکھا تو وہی لڑکی ایک خوش پوش نوجوان سے باتیں کر رہی تھی۔ پھر وہی نوجوان جوار اٹھا کر اس کے سر پر دھرنے لگا۔ اس کے ہاتھوں نے لڑکی کے ہاتھوں کو ضرور چھوڑا ہو گا۔ یہ کیوں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ لڑکی ایسا کیوں کرنے لگی؟ یہ تو ہر جائی معلوم ہوتی ہے! ہر ایک سے محبت! ہر ایک سے پیار! اتنی چنپل! اتنی شوخ کہ ہر راہ گیر سے بے دھڑک دو باتیں کر لے؟ مگر شاید وہ ہر ایک سے اسی طرح پیش آتی ہے جس طرح مجھ سے اشاید میں بھی اس کے لیے ایک معمولی جان پہچان کا ہم پیشہ چھوکر ہوں! میں غصے سے بے تاب ہو گیا۔ وہ میرے قریب آئی اور بولی۔ ”چلو“

میں نے جوار سر پر رکھی اور چل پڑا۔ کچھ دور جا کر وہ بولی۔ ”آج چپ کیوں ہو؟“

میں نے دل کے شعلوں کو ایک لمبی آہ کے دھوکیں کے نیچے دباتے ہوئے کہا۔ ”بس یوں ہی۔“

کچھ دفعے کے بعد وہ پھر بولی۔ ”اس نوجوان کو دیکھا تھام نے؟ اس کا باپ میرے باپ کا بڑا دوست تھا۔ مر گیا ہے بے چارہ اب تو۔“

میرے ٹھوک اور بڑھ گئے۔ باپ دوست تھا تو یہاں بھی اس کا دوست ہو تو تیرا دوست کیوں ہونے لگا۔ مکان قریب آگیا۔ اس نے مزکر مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”رب را کھا۔“

میں نے غم و غصہ کے احساسات پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ”رب را کھا۔“

مگر اس کی آنکھوں میں تنکرات کی ایک لہر تھی۔ اس نے جوار والان میں پھینکی۔ میں نے دیکھا تو وہ منہ کھو لے مظلوم ہرنی کی طرح مجھے گھور رہی تھی۔ میں بے پرواہی سے آگے بڑھ گیا۔

ہر جائی اتو نے میری اولیں محبت کا ستیاناں کرو یا۔

دوسرے دن میں اس کے مکان سے چکر کاٹ کر پھر دی پر پہنچا مجھے نہیں معلوم وہ کب آئی اور کب اس نے جوار کاٹی۔ میں تیار ہو رہا تھا کہ اس کی آواز آئی۔ ”اوھر آنا ذرا۔“

مرے دل نے آواز دی۔ ”ای نوجوان کو آج بھی بلا لے۔“

مگر میں آگے بڑھا۔ جوار اس کے سر پر رکھ دی۔ پھر آ کر اپنا گنجھا اٹھایا اور اس کے پیچے پیچھے چلنے لگا۔ جاتے جاتے وہ اچانک مزکر مجھے گھور نے لگی۔ اس کی مدد بھری آنکھوں کے سرگیں گوشوں پر دو موٹے موٹے قطرے کا نپ رہے تھے۔ اس کے چہرے پر

سرخی کی چھارہی تھی۔ اس کے ابرو پکوں کو چھور دے تھے۔

”تم نے آج چھا چھنپیں پی۔“

اس کی آواز میں فریاد تھی۔

”نمیں۔“

”کیوں؟“

”پانی پی لیا تھا گھر سے۔“

آنسو اس کے رخساروں پر بہٹک لے۔

”ہر جائی! ہر جائی!“

میرے دماغ میں یہ افلاط گو نجتے لگے۔

میرے دل نے پکارا۔ یہ آنسو جھوٹے ہیں۔ یہ ظاہردار یاں ہیں ظاہردار یاں۔ اس نے سمجھنی کھٹی آواز میں پوچھا۔ ”کل تو پیو گے نا؟“

”اگر پانی پی کرنا آیا تو۔“

اس کے بعد وہ مڑی اور اس قدر تیز چلنے لگی کہ اس کے ساتھ میرا چلنا دشوار ہو گیا اور جب وہ گھر پہنچی تو جوار دور پہنچ، دوڑ کر مکان کے اندر گھس گئی۔ میرا دل قدرے کا نیا، میرا قدم قدرے رکا، میرا ماتھا قدرے مخنکا۔ مگر۔ مگر وہ کل والا جوان، اس سے اسے کیا تعلق؟ میں گھر آیا۔ تمام رات وہ لڑکی ڈبڈ بائی ہوئی آنکھوں سے میرا تعاقب کرتی رہی اور جب صبح کو میں اٹھا تو ماں میرے سر بانے کھڑی تھی۔

”انکھوں چھا چھپی لو اور جاؤ۔“

میں نے تجب سے پوچھا۔ ”کہا سے آئی ہے چھا چھپ؟“

”ایک لڑکی لے آئی ہے ابھی ابھی، شاید تم نے کہا تھا اسے۔“

میں نے چھا چھپ لی اور جب درانتی کا ندھے پر رکھی رہی ہاتھ میں لٹکائے اس کے مکان کے قریب سے گزر تو وہ دیوار کے ساتھ پینچ لگائے بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے آنکھیں جھکالیں۔

میں نے پوچھا۔ ”چلوگی؟“

”چھا چھ تو پی لو۔“

میں مسکرا یا۔ اس کے اداس چہرے پر مسرت کی گلابیاں دوڑ گیں۔ وہ تیزی سے میرے پاس آئی۔

”چھا چھ پی تھی یا پانی پیا تھا۔“

”چھا چھ۔“

”چھا چھ؟“

اس نے میری طرف اسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ مجھے اپنے اندر رُبو لے گئی۔

جب ہم جوار اٹھائے واپس آ رہے تھے تو اس نے کہا۔ ”تم خا ہو گئے تھے؟“

”ہاں میں سمجھا تم ہر جائی ہو۔“

مجھے اچانک احساس ہوا کہ یہ لفظ مجھے نہیں کہنا چاہیے تھا۔

اس نے غصے سے جوار دور پھینک دی اور سینہ تانے ہوئے میری طرف بڑھی۔

”مجھے پھر تو ایسا نہ کہو گے؟“

”نہیں، پھر نہیں کہوں گا۔“

واقعی میں پھر اسے ایسا نہ کہنا چاہتا تھا۔

ہم کتنی جلدی خا ہوئے تھے اور کتنی جلدی من گئے تھے۔ چھا چھ کے ایک پیالے سے میرا نصیبا جاگ اٹھا!

اور آج! آج اتنے عرصے کے بعد اسے صرف چھیڑنے کے لیے کہہ دیتا ہوں۔ ”اے میری ہر جائی، ذرا میرا سر تو دبادے!“



مسافر

نئے نئے جھروں کے دائرے میں مغلی گھاس پر سفید بھیڑیں دن بھر پہاڑیوں پر پھرنے کے بعد آنکھیں بند کے ستاری تھیں اور نھا چڑواہا دینا ایک جھاڑی کے پاس پاؤں پسارے بیٹھا تھا۔ سورج مغربی افق کے قریب سنہری بدلوں کے پتلے پتلے دوپتوں میں سے وادی کو گھور رہا تھا۔ دور ایک بیری پر چڑیاں ربر کی تختی منی گیندوں کی طرح اچھل رہی تھیں۔ کوئے اپنے گھونسلوں کو اڑے جا رہے تھے۔ فضائیں مست کر دینے والی تختی اچھلی ہوئی تھی۔ دینا آسان کی نیگلوں گھرا یوں کو دیکھ رہا تھا۔ بھی بھی جیب سے بھنے ہوئے چنے نکال کر آہستہ آہستہ چبانے لگتا یا لمحظہ بھر کے لیے بھیڑوں کو دیکھ لیتا۔ آج رات اس کو وہیں بسر کرنی تھی۔ سرما کا تو معاملہ ہی الگ ہے مگر گرمائیں جنگل ہی میں رات کاٹ دینا کوئی اتنی مشکل بات نہیں ہوتی اور یہ دھقان اور چڑواہے لوگ تو گرمیوں میں شاید ہی کسی دن باہر نہ رہتے ہوں۔ دن کو کھنی کھنی جھاڑیاں اور بھدے بھدے ورخت ان کو دھوپ سے بچاتے ہیں اور رات کو آسان کی کھلی چھت کے نیچے گھاس پر چاورڈاں کر پڑ رہتا ان کے مخصوص اور آزاد دلوں کو تازگی بخشتا ہے۔ سانپ بچوکا خوف دل میں لا سکیں تو بے چاروں کی نیندیں ہی اچاٹ ہو جائیں۔ خدا کے سوا ہر چیز نہیں بے ماہی دکھائی دیتی ہے۔ اور جو صرف خدا سے ڈرتا ہے، خدا بھی اس کی تکہبائی کرتا ہے۔

دینو نے آج مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ آسان پر نظریں جمائے رکھے گا اور معلوم کرے گا کہ اول اول تارے کس طرح نمودار ہوتے ہیں۔ وہ دم سادھ کر گپڑی کو تکیہ بنا کر لیٹ گیا اور آہستہ آہستہ سیاہی مائل رنگ اختیار کرتے ہوئے آسان کو نہایت سکون اور جسمی مشتاق نظروں سے گھورنے لگا۔ ایک ہی نقطے پر نگاہیں گاڑ دینے سے اسے تاروں کے بجائے پہلے تو سبھی بھیڑیں ایک دوسری سے چھٹی ہوئی ریختی معلوم ہو گیں؛ پھر اپنا کچامکان نظر آیا جس کے دروازے پر اس کی بوڑھی ماں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ پھر گھر کا بوسیدہ چوالہا جس پر مٹی تھوپ کر مان نے اسے چوہے کے بجائے کوئی اور بلا بنا دیا تھا۔ پھر چوہے سے دھواں اٹھتا نظر آیا اور پھر ماں کے ہاتھوں میں آتا، گھنی کا برتن اور پھر چلکر میں گھنی کا ”پرانھا“ اور مٹی کی رکابی میں گھنی میں بھنی ہوئی دال! اس کی زبان تالوں سے چٹ گئی! اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر جیب کی طرف گیا اور اس نے دس بارہ چنے نکال کر منہ میں ڈال لیے۔ اچانک وہ اٹھ بیٹھا۔

”مگر تارے کدھر بھاگ گئے؟“

اس نے جھنگلا کر اپنی آنکھیں ملیں اور جب دوبارہ آسمان کی طرف نگاہیں تو لا تعداد شرارے آسمان پر پلکیں جھپک رہے تھے۔ وہ کھیانا ہو کر مسکرا یا۔ انھوں کے ارد گرد چکر کاٹا اور پھر جهاڑی کے پاس آ کر بینھ گیا۔ وہ لیٹنے ہی کو تھا کہ اسے بھیڑوں کے پر لی طرف ایک درخت کے پاس ایک سایہ اوہرہ حرکت کرتا دکھائی دیا۔ اس نے لانچی سنگھامی اور دبے پاؤں اس کی طرف بڑھا۔ اس کے دماغ میں خیالات بے پناہ سرعت سے آنے لگے۔

”کم بہت میری بھیڑیں چڑھنے آیا ہے! سمجھا ہو گا دینوبی تانے سور ہا ہو گا۔ اب میری لانچی کھوپڑی پر پڑی تو سمجھ جائے گا کہ بھیڑوں کے رکھوا لوں کی ایک آنکھ سوتی ہے اور ایک جا گتی ہے۔“

وہ لانچی کو دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے تھامے آہستہ آہستہ اس کے نزدیک ہوتا گیا۔ یکا یک وہ خنک کر کھڑا ہو گیا۔ وہ شخص زور زور سے کھدرا تھا۔ ”کوئی انسان بھی یہاں موجود ہے یا صرف بھیڑیں ہیں؟“

دینو نے جواب دینا چاہا مگر وہ پھر بولا۔ ”ارے بھی میں مسافر ہوں رستہ بھول گیا ہوں، کوئی آس پاس ہے تو میری مدد کرے۔“ دینو کی تلی ہوئی لانچی زمین کی طرف جھک گئی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ بے چارہ مسافر! چتوں کے سوا میرے پاس ہے ہی کچھ نہیں اور اس بچارے کو تو بھوک لگی ہو گی۔ کتنی دردناک ہے اس کی آواز! اللہ! تیری دنیا میں راہ سے کوئی نہ بھکلے! یہ پہاڑی علاقہ پگڈنڈی سے کسی کا پاؤں پھسل جائے تو سو گزر گہری کھائیوں میں جا گرتا ہے۔“

مسافر نے نہایت آہستہ سے اپنے آپ سے کہا۔ ”شاید کوئی نہیں۔“

دینو نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”میں موجود ہوں بھائی! میں موجود ہوں۔ اوہرہ جاؤ، تم رستہ بھول گئے ہو؟ کوئی ضروری کام ہے؟ آج رات نہیں پڑ رہو۔ کل چلے جانا صبح!“

دینو مسافر کا ہاتھ پکڑے جهاڑی کی طرف چلا آ رہا تھا۔ اس نے مسافر کے ٹھہرے ہوئے ہاتھوں کی کپکپاہٹ کو محسوس نہ کیا۔ اس کے سلسلہ تنفس کی بے ربطی اور تیزی! اس کی لمبی لمبی آہیں! سوچے سوچے پوپوئے۔ وہ کچھ نہ دیکھ سکا۔ اندھیرا تھا۔ اور پھر وہ ایک نخاچ رہا تھا جس کے دل کی دھڑکنوں کی اہمیت پر غور کرنے کا وقت نہ تھا۔

مسافر نے پوچھا۔ آگ تو نہ جلا سکو گے؟ دیا سلائی ہے؟ میں تو کہیں بھول آیا ہوں۔“

چڑواہے نے کمر سے لٹکتی ہوئی ایک پوٹی کو کھولتے ہوئے کہا۔ ”میرے پاس تو آگ والے پتھر ہیں۔“

پھر دوسری خوش چھماق نکال کر چادر پر رکھ دیئے۔ جهاڑی سے بہت سی خشک ٹہنیاں توڑ لیں۔ پوٹی سے روئی کا ایک ٹکڑا نکالا

اور منٹوں میں اچھی خاصی آگ تیار کر کے رکھ دی۔

سافرنے جیب سے پاپ کلتے ہوئے پوچھا۔ ”چر واہے تم کہاں رہتے ہو؟“

دینواں نخنے سے حقے کو بغوردی کیجئے کر بولा۔ ”اس پیہاڑی سے ورے میرا گاؤں ہے۔ صاف سحرے تالاب ہیں۔ تین دکانیں ہیں۔ نمبردار کے پاس کالے کالے تلوں والا باجا ہے۔ نور آباد کا نام تم نے کبھی نہیں سنایا؟ اتنا مشہور ہے اور تم نہیں جانتے؟“

”مجھے وہیں جانا ہے۔ گاؤں میں کسی کے گھر نیم کا درخت بھی ہے؟“

”ہاں وہی تو نمبردار کا گھر ہے! اور آج تو اس کی لڑکی کی شادی ہو گی۔ خوب رونق ہو گی وہاں۔ میں تو اماں سے کہہ آیا تھا کہ خدا
خود ہی نہ اڑا جانا، میرا حصہ رکھ چھوڑنا، کل شام کو آ کر میں گرم کر کے کھالوں گا۔ تم بھی کل شام ہی چلے چلنا سافر!“

”مجھے ضرور جانا ہے بھائی۔ اور ابھی جانا ہے، مجھے اپنے گاؤں کا راستہ دکھادو۔“

”لیکن اتنی اندر ہیری رات ہے۔ دو چھپے کی تو پلڈنڈی ہے۔ پاؤں تلے سے ایک پتھر کھک جائے تو ڈھونڈے سے ہڈیوں کا
نشان بھی نہ ملے۔ تم کیا کرتے ہو؟ نہیں سور ہو۔ یہ میں اپنی چادر بچھائے دیتا ہوں۔ اور تم تو بھوکے ہو گے یہ لوچنے۔“

سافرنے چر واہے کی جیب سے چنوں کی ایک مٹھی بھر لی اور ایک ایک دانہ کر کے منہ میں ڈالنے لگا۔

”میں پہلے بھی اس راہ پر آتا جاتا رہا ہوں۔ تم مجھے رستے پر لگاؤ، عمر بھر تمہیں یاد رکھوں گا۔“

”مگر بھائی سافر تمہیں ڈر نہیں لگتا؟“

”نہیں مجھے آج رات ضرور جانا ہے۔ اگر آج نہ جاؤں تو پھر بھی نہ جاسکوں گا۔ تم یہ بتیں نہیں سمجھتے۔ تمہیں تکلیف تو ہو گی لیکن
نہیں سے کچھ پتہ بتا دو۔ میں خود ڈھونڈنے کا لوں گا۔“

چر واہا بے کل ہو کر اٹھا اور بولा۔ ”اچھا چلو، لیکن واپس کب آؤ گے؟“

”یہ میں نہیں کہہ سکتا لیکن یہ وعدہ کرتا ہوں کہ ایک بار تمہیں ملوں گا ضرور! تم اتنے اچھے لڑکے ہو!“

چر واہے کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ دونوں چل پڑے۔ ہر طرف مرعوب کن سکوت تھا۔ کبھی کبھی بھیڑوں کے گلے سے
کسی بھیڑ کی آواز آ جاتی تھی اور چر واہا گردن پھیر کر ایک نظر اوہر دیکھ لیتا تھا۔ دونوں خاموش چلتے گئے۔ آخر ایک بہت بڑے درخت
کے پاس پہنچ کر چر واہا رک گیا۔

”یہ ہے رستہ آ گے جا کر بہت نیک ہو جاتا ہے۔ تاروں کی لو میں شاہد تمہیں کوئی نشان ملا جائے۔ تین کوں ہے یہاں سے گاؤں۔“

آہستہ آہستہ بھی جاؤ تو آدمی رات کو پہنچ جاؤ گے۔“

سافر آگے بڑھا۔ چرواہے کے سر پر ہاتھ رکھ کر دو چار لمحے خدا جانے کس سوچ میں ڈوبا رہا۔ اس کے جسم میں ایک تحریری سی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ آگے بڑھنے کے بجائے دو قدم پیچے ہٹ گیا مگر پھر اچانک آگے بڑھا اور چند لمحوں کے بعد اندر ہیرے میں مل گیا۔ چرواہے کے دل پر بارسا پڑ گیا۔ اس کے قدم بھاری ہو گئے، آنکھیں جلنے لگیں۔ بے چارہ مسافر راستہ بھول نہ جائے! اگر میں اسے گاؤں پہنچا آتا تو کیا تھا! اس نے زور زور سے چیننا شروع کیا۔ ”مسافر! بھائی مسافر! او بھائی مسافر!...“

اس کی آواز خاموش سیاہ پہاڑیوں کی چوٹیوں سے نکراتی ہوئی سرمی فضا میں کھو گئی۔ درختوں سے دو چار چڑیاں پھر پھر اکراڑیں اور ٹہنیوں سے نکلا کر کہیں غائب ہو گئیں۔ دور سے ایک بھیڑ کی آواز سنائی دی۔ چرواہا سر جھکائے اپنی جگہ پر آ گیا۔ وہیں بیٹھ گیا جہاں مسافر بیٹھا رہا تھا۔ آدمی رات تک نیند نہ آئی اور جب سویا تو اس نے دیکھا کہ مسافر اپنا نخا ساختہ پی رہا ہے۔ وہ اس کے قریب آ رہا تھا۔ وہ اسے ملنے کے لیے بے چین ہو کر اٹھا اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ رات بدستور اندر ہیری تھی۔ تارے بدستور آنکھ پھولی سکھیل رہے تھے۔

صحیح اسے بہت سے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ وہ اٹھا، سامنے چار شخص ہانپتے ہوئے آرہے تھے۔

”میاں چرواہے، یہاں سے کل کوئی نوجوان تو نہیں گزر را؟“

”گزر اتھا۔“

”کیسا تھا؟ کیا الباس تھا؟ کدھر گیا؟“

”لباس جو ان تھا۔ لبے لبے بال تھے۔ ایک نخا حلقہ پی رہا تھا۔ کہتا تھا کہ مجھے نور آ باوضور جانا ہے۔“

اک شخص نے کہا۔ ”وہی ہو گا۔“

پھر آگے بڑھ کر پوچھنے لگا۔ ”کس وقت گیا ہے؟“

”رات کو۔“

چاروں نے یک زبان ہو کر تجھ سے کہا۔ ”رات کو۔“

پھر تیزی سے آگے بڑھ گئے۔

اس شام جب چرواہا واپس گھر آیا اور حلواً گرم کرنے لگا تو اسے معلوم ہوا کہ رات کو علاقے کے بڑے افسر (آن زیری مجنزیت)

کا اکلوتا نو جوان بیٹا ایک گہری کھائی میں گر کر مر گیا ہے! جب اس کے مرنے کی خبر گاؤں میں پھیلی تو نمبردار کی بیٹی دہن کے کپڑے پہننے پہننے بے ہوش ہو گئی!

چڑواہا بھی تک سافر کے لیے پگڈنڈیوں پر نگاہیں جھائے رکھتا ہے! وہ یہ معما نہیں سمجھا!



غیرت مند بیٹا

جب میری زبان نے ابا کہنا سیکھا تو ابا چل بے۔ میری ماں کہتی تھی ”جب تمہارے ابا نے آخری بار اپنی دھنڈی دھنڈی نجیف آنکھیں کھول کر درود یوار پر نظریں ڈالی تھیں تو میرا لکلیج پھٹ گیا تھا۔ وہ بھوک سے مر اتھا چلتا۔ تیرا باپ بھوک سے مر اتھا۔ تو اس دن ابا کے پاؤں سے چٹ کر دیا تھا۔

ہوش سنبھالنے کے بعد گھر میں ماں کے سوا میں نے کسی کی صورت نہ دیکھی تھی۔ میرا سب کچھ میری ماں تھی۔ مجھے خوب یادے وہ میری انگلی پکڑ کر نمبردار کے گھر لے جاتی، وہاں دن بھر چکی پتی جاتی، روتی جاتی اور دروناک سروں میں چند الفاظ گنتنگی جاتی۔ میں نے ایک دن پوچھا۔ ”ماں تم گاتی بھی ہو روتی بھی ہو؟“ وہ مٹھی بھردانے چکل کے دہانے میں ڈالتے ہوئے بولی۔ ”بیٹا صرف روتی رہوں تو گانہ سکوں گی اور گانہ سکی تو تم رونے لگو گے، اگر صرف گاتی رہوں تو رونہ سکوں گی اور رونہ سکی تو تمہارے ابا کی روح روٹھ جائے گی۔“

ابا!..... میں نے سوچا، کیا میرا بھی کوئی باپ تھا؟ پڑوس میں رحیم میاں رہتے ہیں، ان کو باپ کا کتنا انتظار رہتا ہے اور پھر جب ان کا باپ قبے سے آتا ہے تو قسم کی مسخانیوں اور رنگ رنگ کے کھلونوں سے لدا چند! میں سمجھتا تھا کہ میری صرف ماں ہی ہے۔ کیا میرا بھی کوئی باپ تھا؟

میں نے پوچھا۔ ”میرا باپ کدھر چلا گیا ہے ماں؟“

”تیرا باپ دور راز ملکوں میں چلا گیا ہے بیٹا، جہاں نہ وہ ہل چلاتا ہے، نہ زمین کھو دتا ہے، نہ تیشیں ڈھوتا ہے، نہ پھر کو اس کے پاؤں گرم گرم زمیں پر پڑتے ہیں۔ وہ ہم سے روٹھ گیا ہے۔ کبھی ہم بھی اس کے پاس چلے چلیں گے۔“

اس دن سے میرا جی کھلوں سے بالکل اچاث ہو گیا۔ گلی میں میرے ہم عمر میرا انتظار کرتے کرتے چک کر چلے جاتے اور میں ماں کے پہلو میں بیٹھا ابا کے متعلق باتیں سن کرتا۔ ماں کہا کرتی تھیں۔ ”تمہارا باپ غیرت والامرد تھا۔ اس نے کسی کے پاؤں نہیں چوئے، اس نے کسی کی خوشامد نہیں کی۔ اس نے سر پر تو کریاں اٹھائیں ہیں، پیٹھ پر درودوں کی بوریاں لا دکراوچی اور چیزیں بیڑھیوں پر چڑھا ہے، پتھر میں اور سخت زمینیوں میں مل چلائے ہیں لیکن اس نے کسی کے آگے گے ہاتھ نہیں پھیلایا، کسی سے کچھ مانگا نہیں۔ اس نے دکھ

بھوگے لیکن وہ روپا نہیں۔ وہ خالی پیٹ بھی ہوتا تو ہستے ہستے سوتا اور ہستے ہستے جاتا۔ اس نے تھک آ کر بھی موت کو دعوت نہ دی۔ وہ تو رونا جانتا ہی نہ تھا۔ وہ کہتا تھا، جو اپنی مصیبتوں سے تھک آ کر رونے کے قابل ہی نہیں۔ لیکن یہاں! جب اس کی سانس حلق میں اٹک رہی تھی اور تم اس کے خشک بھرے ہوئے بالوں میں اپنی تنفسی انگلیاں ڈالے خاموش کھڑے تھے تو اس وقت ایک قطرہ اس کی آنکھوں سے نکل کر اس کے رخسار پر ڈھلک آیا اور پھر ایک طرف بہہ کر بوسیدہ نکلے میں جذب ہو گیا۔ یہ اس کا پہلا اور آخری آنسو تھا اور اس آخری آنسو کے ساتھ اس کی آخری سانس بھی رک گئی۔

اتنا بھادر باپ! میں اب کچھ سمجھ دار ہو نے لگا تھا۔ غریبوں کے بچے چھوٹی عمر میں ہی بڑی بڑی باتیں سمجھنے لگتے ہیں۔ میں نے سوچا، اگر وہ زندہ ہوتا تو کل رجیم میاں مجھے آنکھیں نہ دکھاتے۔ میری جیب بھی کھانڈ کے لذوؤں سے بھری ہوتی۔ مجھے بھی چوپال پر زمیندار اپنے پاس بٹھاتے۔

میری ماں کے بالوں پر آئے کی تھے ہمیشہ جبی رہی اور ہمارا چولہا اکثر ملختا ہی رہا۔ اگر کام کے مطابق دام ملا کرتے تو مزدوری کو کون برآ کہتا؟ رات کو بھوکا سوتا، دن کو خالی پیٹ بیٹھے رہنا مجھے کچھ انوکھا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میں سمجھتا تھا، ہر کوئی اسی طرح رہتا ہے۔ سب کی ماں یوں ہی رات دن کھوئی کھوئی سی رہتی ہیں۔

میں بڑا ہوتا گیا تو میرے دل کی وھرائیں بھی ذرا تیز اور بے ربط ہوتی گئیں۔ میری انتڑیاں ذرا زیادہ بل کھانے لگیں۔ مجھے زیادہ بھوک محسوس ہونے لگی۔ ماں کے کھر درے ہاتھوں کی بے شمار گاندوں میں فاقوں کے لاتعداً افسانے دکھانی دینے لگے۔ میں اپنے آپ کو ایک تباہ حال انسان خیال کرنے لگا۔

مجھے ایک روز ایک زمیندار نے کہا۔ ”ارے تو اتنا بڑا جوان ہو گیا ہے اور گلیوں میں مارا مارا پھرتا ہے کوئی کام کیوں نہیں کرتا؟“ میرے ہاں اک بل چلانے والے کی جگہ خالی ہے، محنت سے کام کرے تو ماہوار دور و پے دے دیا کروں گا۔ منظور ہے؟“ میں نے اپنے آپ کو کہتے ہوئے سنا۔ ”منظور ہے۔“

وہ مجھے ایک روپی بھی کہتا تو مجھے منظور تھا۔

ماں کو میں نے یہ بتایا تو وہ خوش ہو گئی اور مجھے مرحوم ابا کی باتیں سنانے لگی کہ کس طرح اس نے بھی ایک زمیندار کی ملازمت کی تھی لیکن زمیندار اس سے کچھ اچھی طرح پیش نہ آیا اور وہ بل پھینک کر گھر آ بیٹھا۔

..... اور حیرت کی بات ہے کہ تین بفتنے بعد زمیندار سے میری بھی جھڑپ ہو گئی۔ وہ کہنے لگا۔ ”جا بے جا“ گھر میں کھانے کو جو کا

آنہیں اور دماغ دیکھو تو جیسے گاؤں بھر کا راجہ ہی ہے۔“ میں نے کاندھے پر سے مل اتا کر کر اس کی چوکھت پر دے مارا اور کہا۔ ”مگر میں کھانے کو نہیں تو کیا دل میں غیرت بھی نہیں؟ تیری دو کوڑیوں کے بھروسے پر نہیں جی رہے۔ ہاتھ بھر ہیں تو بھوکوں نہیں مریں گے، تو آنکھیں نہ دکھا۔“

زمیندار تو جہاں کھڑا تھا وہیں جم کر رہ گیا۔ جو شخص بغیر حیل و جھٹ کے دور و پے ماہوار پر نوکری کرنے پر رضا مند ہو جائے وہ مالک سے ناراض ہو کر چل دے تو کیا اسے مرنے کا خوف نہیں ہوتا؟ وہ حیران ہو رہا تھا کہ کیا غریبوں کو بھی غیرت کا احساس ہوتا ہے؟ کیا یہ بھی سوچ سکتے ہیں؟ کیا مفلس غیرت اور سیرت کا خون نہیں کر دیتی؟

اس کے بعد تین چار بار مجھے اپنا پیٹ غیرت کے بد لے خالی رکھنا پڑا مان، کتنی بہادر تھی میری ماں! کتنی عجیب عورت تھی وہ عام عورتوں سے کسی قدر مختلف! میری ماں خوش ہو جاتی تھی اور کہتی تھی۔ ”شاش بینا! فاقہ کر لیں گے لیکن کہیں نہ نہیں گے۔ اپنا گلا کٹتے دیکھ لیں گے لیکن رو گھیں گے نہیں۔ آنسوؤں کو اگر بہت ستا کر دیا جائے تو ان کی قدر کون جانے۔ یہ موتی دل ہی میں محفوظ رکھنے کے قابل ہیں، مٹی میں ملانے کے لائق نہیں!“

افلاس اور وقت دونوں نے میرے ماں کی صحت پر برا اثر ڈالا۔ ماں کے ماتھے پر لکیریں پڑ گئیں۔ آنکھوں کے کناروں پر بھریوں کے جال بچھے گئے۔ ہتھیلوں پر چکلی کا ہتھا تھامنے کا نہیں ابھر آگئیں۔ آنسو روکتے روکتے آنکھوں کے ڈورے ابھر آئے۔ وہ اتنی بڑی عمر کی تو نہ تھی مگر افلاس بری بلا ہے۔ مفلس کی جوانی گزرنے کی رفتار کچھ زیادہ ہی تیز ہوتی ہے!

میں نے اس کے لیے نوکریاں اٹھائیں۔ پتھروں اور اینٹوں کے چکڑے کھینچے۔ پیٹھ پر بوریاں لا دیں لیکن جہاں کسی کا پاؤں مجھے ٹھکرانے کے لیے آگے بڑھا، جہاں کسی کی زبان میرے غرور لشکوں کو خس پہنچانے کے لیے حرکت میں آئی، میں نے نوکریاں الٹ دیں، چکڑے کیچھے دھکل دیئے اور بوریاں پھینک دیں۔ ماں سے زیادہ مجھے اپنے مرحوم ابا کی پاکیزہ سیرت کا پاس تھا۔ میں اپنے باپ کا معزز جانشیں بننے کا ممکنی تھا۔

آخر ایک روز میری ماں بیمار پڑ گئی۔ غریب بیمار پڑیں تو موت کو اور کام پڑ جاتے ہیں۔ غریبوں پر مصیبتیں نہیں تو قدرت کی بخششوں کو نہیں آ جاتی ہے۔ وہ بیمار پڑی اور تین مہینے کھاث پر کر دیں بدلتی رہی۔ میں نے پیاس بھگو بھگو کر اس کے ماتھے پر رکھیں۔ میں نے اس کے پاؤں رگڑ رگڑ کر اپنے ہاتھوں میں چھالے پیدا کر لیے۔ میں دن بھر مزدوری کر کے رات کو گھر واپس آتا تو اس کی خشک زبان پر اپنے پینے سے کمائی ہوئے دوا کے چند قطرے پکاتے ہوئے مجھے جو سرت حاصل ہوتی، اس کا تذکرہ کروں تو آپ

جیران رہ جائیں۔

پھر بھیش کی طرح مزدوری میرے ہاتھ سے جانے لگی۔ ٹھیکے دار بولا۔ ”بوریاں اٹھاتے اٹھاتے پیٹھ کا چڑا جس چلا ہے اور گاؤں کے بڑے حکیم جی سے دو اخیر یہ نے بھاگا جا رہا ہے۔ ارے تو کسی راہ چلتے سنیا سی کا دامن پکڑ۔ کوئی گولی دوں لے کر مر یعنے سے جان چھڑا اور نہ عمر بھرا سے چھٹکارا نہ ہوگا۔ جو بوڑھیاں نہ مرتی ہیں نہ جنتی ہیں وہ ماں بھی ہوں تو انہیں جہنم میں جھونک دینا چاہیے۔“ میری رگوں میں جیسے کسی نے پارہ بھردیا۔ میرے دل و دماغ کا گودانتشوں کے ذریعے باہر گھسیٹا جانے لگا لیکن ماں کراہتی ہوئی میرے پر وہ تصور پر نمودار ہوئی اور میں نے خاموشی سے بوری اٹھا کر پیٹھ پر دھر لی اور آگے بڑھ گیا۔

ٹھیکے دار کے روز روز کے طمعنے سن سن کر میرا لکھج پک گیا۔ میں نے ماں کو یہ حال سنایا تو وہ نحیف جان ترپ ہی تو اٹھی! کہنے لگی۔ ”اب سارا دن یہیں میرے پاس بیٹھا رہا کہ نہیں تو میں خفا ہو جاؤں گی۔ منہوس ٹھیکیدار کی جوتیاں چاثا پھرتا ہے۔ قیامت میں اپنے ابا کو کیا منہ دکھائے گا؟“

تمن دن میں باہر نہ لگلا۔ چوتھے دن ماں کی حالت خراب ہو گئی۔ مگر میں دو اخیر یہ نے کوپھوٹی کوڑی تک نہ تھی مگر وہ بے ہوش ہو رہی تھی۔ اس کے زرد ماتھے پر پینے کے قطرے نکل کر اس کے خاکستری بالوں میں الجھ رہے تھے۔ میں اسے یوں بے کسی سے مرتا نہ دیکھ سکتا تھا۔ کسی حکیم کے آگے دست سوال دراز کرنا پڑے گا۔ ابا خفا ہوں گے ماں روٹھ جائے گی۔ لیکن لیکن! نہیں مجھے جانا چاہیے۔

میں دروازے سے نکل کر گلیوں میں سر پٹ بھاگنے لگا۔ میرا دماغ گونج رہا تھا۔ میرا سارا وجہ و مختہنے سے پینے میں شراب پور تھا۔ اچانک مجھے لا تھدا دیوتکوں کی قطاریں نظر آئیں۔ پھر ایک مہربان صورت بزرگ! میں نے اپنے آپ کو اس کے قدموں میں گرتے ہوئے گھوس کیا۔ میری زبان بے تحاشا تر پئے گئی۔

”حکیم جی اللہ تھجے مالا مال کر دے۔ اللہ تھجے ڈیروں روپے دے۔ میری ماں مرنے ہے۔ اس کے لیے دوا کے چند قطرے۔ میں غریب ہوں۔ میرے پاس ایک کوڑی تک نہیں۔ میں تیرے پاؤں پڑتا ہوں۔ مجھے راہ خدا و قطرے دے دے کہ میری ماں فتح جائے۔ میں ساری عمر تیرا نو کر رہوں گا۔ ساری عمر تیرے پاؤں دھوؤں گا۔ میری ماں کو بچائے وہ مر نے کو ہے حکیم جی، حکیم جی!“ بوڑھا بزرگ تیزی سے اٹھا۔ ایک بوتل بغل میں دبائی اور میرے ساتھ بھاگنے لگا، مجھ سے آگے نکل گیا۔ ایک جگہ میں پکار اٹھا۔ ”یہی پرانے چھپروالا مکان ہے حکیم جی۔“

وہ تیر کی طرح مکان کے اندر گھس گیا۔ میں پھر بھی چند لمحوں میں ماں کے پاس تھا۔ دیواریں ناق رہی تھیں، چھت اور ابھری جا رہی تھی، فرش پانی بن کر بہرہ رہا تھا۔ میں نے سمجھا میں نے حکیم جی کی جوتیوں کو بوس دیا ہے! امیری پیشانی جھک گئی۔ میں ہوا میں تیر رہا ہوں۔ میں آسمانوں کی طرف پرواز کر رہا ہوں!

جب میں نے آنکھ کھولی تو حکیم جی میرے سرہانے آبدیدہ بیٹھے تھے۔

میں نے چیخ کر پوچھا۔ ”میری ماں؟“

باہر کسی درخت پر ایک چیل زور سے چلا آئی۔ حکیم جی کی ڈاڑھی آنسوؤں سے بھیگ گئی۔

میرے کانوں میں ماں کے یہ الفاظ گوئیختے لگے۔ ”وہ بھوک سے مرا تھا پیٹا! تیرا باپ بھوک سے مرا تھا!“

میں نے تیزی سے اپنے آنسو پوچھے۔ مکرانے کی کوشش کرتے ہوئے انھا اور مرحوم ماں کی سرد پیشانی کو چوم کر دیوار سے پینچھے گرا کر پینچھے گیا۔

میں اس دن بالکل نہ رویا!



حق بجانب

کیا کبھی کسی عجائب خانے میں کسی خور آسمانی کا موم یا مرمر میں ڈھلا ہوا مجسہ آپ کی نظروں سے گزرا ہے جس کے سیاہی مائل سنہرے بال اس کے بھرے بھرے گداشت انوں پر بکھرے ہوئے ہوں اور جن کے بارے اس کے تمام جسم کے نمایاں خطوط میں ایک بہم ساختم پڑ گیا ہوا! جس کے لبوں کے گھرے باریک گوشوں میں مسرت غم کا ایک قیامت آفرین امتزاج کروٹیں لے رہا ہوا اور بغور دیکھنے سے یوں معلوم ہو جیسے صناع نے انہیں ابدی ارتقاش کی سزا دے رکھی ہے! جس کی غزالی آنکھوں کی سیاہی کا آدھا حصہ اپر کی پلکوں نے ڈھانپ لیا ہو۔ جیسے وہ فرط غم سے بے ہوش ہو رہی ہے اور پلکوں کے ساتھ دو آبدار موئی آنسوؤں کی شکل میں یوں لرز رہے ہوں جیسے دل کسی رگ کے ذریعے اپنی اس کھوئی ہوئی دولت کو پھرا پنے اندر جذب کرنے کی خواہش میں انہیں واپس کھینچ رہا ہے! جس کا سادہ لباس اس پر اطلس و سنجاب کے انباروں سے زیادہ سچ رہا ہوا اور جس کے دونوں ہاتھ یوں اٹھے ہوئے ہوں جیسے کوئی شخص درود سرکی شدت سے مجبور ہو کر اپنے دونوں ہاتھ پیشانی کی طرف لے جانے کا اٹھاتا ہے!

کیا آپ نے کبھی ایسا مجسم دیکھا ہے؟

دیکھاتو میں نے بھی نہیں لیکن میں اگر زنگ تراش ہوتا تو اس قسم کا مجسم بنانے میں مجھے نہایت آسمانی ہوتی کیوں کہ ایک رات میں نے اس تراش خراش کی ایک لڑکی کو اپنے کرے میں پناہ دی تھی اور اس کے بے پناہ اداں حسن کو میں نے اپنے احساسات میں کچھ اس طرح منتقل کر لیا تھا کہ آج بارہ برس کے بعد بھی میں اس کے جسم کا ایک ایک خط ایک ایک خم یا آسمانی دیکھ سکتا ہوں۔

شاید آپ اس کا حال سننا پسند فرمائیں۔ سننے لیکن سن کر بھلا دیجئے کہ چھپتے ہوئے خیال کو اپنے دل میں بہت دیر تک محفوظ رکھنا زندگی کو تلخ بنا دیتا ہے اور اس تلخی کو شیرینی میں تبدیل ہونے کے لیے کم از کم بارہ برس کا عرصہ درکار ہے۔

”بارہ برس کا عرصہ ہوا میں نے لا ہو رکھا اس لیے چھوڑ دیا کہ اپنے گاؤں کی معصوم فضائیں میں رہ کر اپنے دل کو معاشرے کے زنگ سے پاک کر دوں اور ایک کتاب لکھوں جو غیر جانبدارانہ طریقے سے محبت کی تلخیوں اور شیرینیوں پر ایک بہسٹ تبصرہ ہو۔ گاؤں میں آ کر میں نے اپنی طبیعت میں کوئی خاص فرق محسوس نہ کیا اور میرا وجہ ان وہاں بھی تشنہ اطمینان ہی رہا۔ آخر گاؤں سے باہر تین میل کے فاصلے پر میں اپنے کھیتوں میں چلا گیا۔ وہاں آپاٹی کے لیے ایک کنوں تھا جس کے اردو گرد بیزہ ہی بیزہ تھا۔ پاس ہی

ایک کوئی بھی تھی جود و آدمیوں کے رہنے کو بہت کافی تھی۔ میں وہیں اپنا سامان انٹھوا لایا۔ صبح شام مجھے ایک ملازم کھانا دے جاتا اور میں اطمینان سے رات دن قلم گھٹا رہتا۔ ہاں کئی بار مجھے اپنی آنکھوں کو آنسوؤں سے بھگنا پڑا کیونکہ آنسوؤں کے بغیر اس منظر کی نفاذی اچھی طرح نہیں کر سکتا تھا جس میں میرے ناول کے کردار آنسو بھار ہے ہوں۔

ایک ایسی ہی رات تھی۔ صبح میرے ایک دوست اور کو ولایت جاتے ہوئے مجھے سے ملنے آتا تھا۔ میں نے سب سامان قرینے سے رکھا اور قلم لے کر بیٹھ گیا۔ آج مجھے ناول کے ہیر و اور ہیر و ن کی آخری جدائی کا نقشہ کھینچنا تھا۔ میں نے میر کا ایک شعر گنگنا نا شروع کیا اور ہو لے ہو لے تلخ یا دیس میرے ذہن کی دھندلی سطح پر ابھرنے لگیں۔ دل کو دھکا سالگا اور آنسو نکل آئے۔ جدائی کی گھڑیاں اپنی روح فر ساطوالت کے ساتھ میرے سامنے لہرانے لگیں۔ میں نے قلم اٹھایا اور لکھنے ہی کو تھا کہ میرے کا نوں میں ایک ایسی آواز آئی جیسے کوئی مضبوط پودوں کو جڑ سے اکھیر رہا ہو یا توڑ رہا ہو۔ میں قلم رکھ کر باہر بھاگ نکلا۔

میں پوری قوت سے پکارا۔ ”کون ہے؟“

آواز بند ہو گئی۔ کائنات پر مکمل سکوت طاری تھا۔ صرف خاموشی اپنے ختم نہ ہونے والے سروں میں چاروں جانب گنگنا رہی تھی۔ پودوں میں مجھے ایک سایہ سالرزتا معلوم ہوا۔!

میں نے پھر اسی انداز میں پوچھا۔ ”کون ہے؟“

میں تیزی سے سائے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

”ایک مسکین عورت ہوں جناب! کچھ کھانے کو مل جائے تو دعا نہیں دوں گی۔ رستہ بھول گئی ہوں۔ میں نے فصل کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ مجھے معاف کرو سمجھے!“

آواز میں بڑا درود تھا۔ اس علاقے میں ایسی سلبجی ہوئی گفتگوں کر میں تیران بھی ہوا پھر پندرہ میں دنوں سے میں نے کسی عورت کو نہ دیکھا تھا اور عورتوں کی نفیات کا تجویز کرتے وقت مجھے محسوس ہوتا تھا کہ ایک ناقابل بیان گھبراہٹ میرے قلم کی روائی میں رکاوٹ پیدا کر رہی ہے! مجھے کسی عورت کو صرف دیکھ لینے کی ضرورت تھی۔ میں نے اپنے لبھ کو حسب بساط زرم کرتے ہوئے کہا۔ ”کوئی بات نہیں، آئیے میں حتی الوع آپ کو آرام پہنچانے کی کوشش کروں گا؛“

وہ میرے نزدیک آگئی۔ تارے آسمان پر کسی کامیاب ساحر کی آنکھوں کی طرح چک رہے تھے۔ میں ان کی لو میں صرف یہ دیکھ سکا کہ وہ عورت سرو کی طرح دراز قد ہے اور بید مجنوں کی طرح نازک اور دبلی ہے۔ میں آگے آگے چل پڑا اور جب ہم کمرے

میں داخل ہوئے تو کافی دیر تک مجھے اس کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ میرے پاس صبح کے ناشتے کے لیے کافی بسکٹ تھے۔ میں نے ایک پلیٹ میں بسکٹ اس کے آگے رکھ دیئے اور ایک گلاس میں کنوئیں سے تازہ پانی لے آیا۔

وہ بولی۔ ”آپ تکلیف فرماء ہے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”کوئی تکلیف نہیں۔“

میری آنکھیں جھکی رہیں۔ میں ڈرتا تھا کہ پہلی بار دیکھتے وقت میری روح میری آنکھوں کی راہ سے باہر نہ آجائے۔ وہ آہستہ آہستہ بسکٹ چبانے لگی۔ میں نے اپنی ساری قوتیں مجتمع کر کے اس کی طرف دیکھیں لیا اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا!

میری شاعرانہ اقتاد طبع نے کہا۔ ”کوئی حور کہکشاں پر چہل قدمی کرنے نکلی ہو گی اور افق کے پار زمین پر اتر کر رستہ بھول گئی ہو گی!“

اب میری ہمت بندھ گئی۔ میں نے اسے خوب جی بھر کر دیکھا۔ شاید آپ کو تعجب ہو لیکن میرا خیال ہے کہ نسل آدم اس اجنبی عورت پر جس قدر ناز کرے کم ہے۔ انسان واقعی فرشتوں کے سجدے کا مستحق تھا! مجھے اس دن یہ خیال آیا!

جب وہ بسکٹ کھا چکی اور پانی پی چکی تو اس نے ایک لمبی سانس لی جیسے ساری کائنات کو اپنے اندر جذب کر لے گی۔ اس کے تنہنے پھر کے اور دو آنسو اس کے آنکھوں میں ابھر کر ان شفاف کثوروں پر ایک مہین آلبی تہہ بن کر چھا گئے۔

وہ بولی۔ ”آپ کی مہربانی کا شکر یہ۔ اب آپ ذرا دوستک میری رہنمائی کر سکتے ہیں؟ اسٹیشن کو جانا ہے مجھے!“

”کدھر کا ارادہ ہے آپ کا؟“

”کہیں کا بھی ارادہ نہیں!“

”رات کو آپ سوئی بھی نہیں“

”نیند آتی تو کہیں پڑھ رہتی!“

”آپ معمومی معلوم ہوتی ہیں۔“

”آنسو بس میں نہیں ورنہ آپ کو شکایت کا موقع نہ دیتی۔“

”شکایت؟“

”ہاں، اس دنیا کو درد مندوں کے آنسوؤں کے متعلق بڑی شکایت ہے۔“

”مجھے تو نہیں، میں تو انہیں ایک لمحت سمجھتا ہوں۔“

وہ خاموش ہو گئی۔ پچھلے دیر اپنے ہاتھوں کو یوں ہی ملتی رہی، پھر انھی اور کہنے لگی۔ ”اب اجازت دیجئے۔“
میں بھی انھیں کھڑا ہوا۔

میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”دیکھئے تا، آپ یہاں رات گزار سکتی ہیں، میں باہر درخت تلے پڑا رہوں گا۔ آج کل سرو یاں
تو ہیں نہیں اور مکبل بھی میرے پاس موجود ہے۔“

وہ پچھلے سوچنے لگی۔ بے خبری میں اس کے سرکی میلی چادر کھٹک کے نیچے گر گئی، بال بکھر گئے۔ انہیں امنہ آئیں۔ اس نے دونوں
ہاتھ یوں اوپر اٹھائے جیسے کوئی شخص دردسر کی شدت سے مجبور ہو کر اپنے دونوں ہاتھ پیشانی کی طرف لے جانے کو اٹھاتا ہے! وہ غم کی
دیوبی کا ایک صحیح اور مکمل مجسمہ تھی!

میں نے متوجہ ہو کر پوچھا۔ ”آپ کیا سوچ رہی ہیں؟“

اس جاہل علاقے میں مجھے اس قسم کی عورت سے کبھی پالا نہیں پڑا تھا میں نے یہاں بھی کئی مغموم و مخدوں لڑکیاں دیکھی ہیں لیکن
اہر ان کی شادی کے ذلکے بچے اور انہوں نے بخوبی اپنے ہاتھوں میں مہندی رچائی اور نوجوان ناکام ہو کر کسی اور سے پہنچیں
بڑھانے لگے یا کوئی بڑا حوصلے والا ہوا تو پچھلے دونوں کے لیے بیمار ہو گیا۔ یہ عورت تو میرے سامنے یونانی صنیات کا ایک بے خل
مرمریں شاہکار بن کر کھڑی تھی۔

”طنبورے کے تارٹوٹ جائیں تو اس کی لکڑی کو آگ میں جلا دیا جاتا ہے۔ آپ جانتے ہیں تا؟ گناچوں لیا جائے تو بیلوں کے
آگے پھینک دیا جاتا ہے۔ آپ سمجھتے ہیں نا؟ گاگر سے پانی پی لیا جائے تو پھر کوئی پیاسا اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ آپ دیکھتے ہیں
نما؟ آپ مجھے کوئی آوارہ عورت سمجھ رہے ہوں گے یا کوئی بیوہ یا کوئی بچکارن! آپ سے یہ بھی نیمت ہے ورنہ میں درحقیقت پچھلے نہیں۔
میرا وجہ صفر کے برابر ہے۔“

میں نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”آپ بیٹھ کیوں نہیں جاتیں؟“

وہ شاید بیٹھنا بھول گئی تھی۔ اس نے تیزی سے اپنی چادر زمین سے اٹھائی اور سر پر دھر لی۔ پھر بیٹھ کر کہنے لگی۔ ”سانس لینے کو
زندگی نہیں کہتے۔ یہ تو بیگار ہے بیگار۔ روح کی قید کی میعاد پوری ہو رہی ہے۔ زندگی تو وہ تھی جب میں انہیں بزرہ زاروں میں انہیں
چراگا ہوں میں گھوڑے پر سوار ہو کر شکار کھیلا کرتی تھیں۔ زندگی تو وہ تھی جب میں نے انہیں کھیتوں میں اپنے دل کو دھر کنا سکھایا تھا۔

زندگی تو وہ تھی جب میرے پا تھے میں بھی کسی کا ہاتھ تھا۔ اب تو حضرت! بسکٹ کھا کر پانی پی لینا اور آگے چل دینا ایسے زندگی ہے! یہ زندگی ہو گی! مجھے کسی سے شکایت نہیں، شکایت کسی حق پر کسی دعوے پر کی جاتی ہے اور میں کسی چیز کی حقدار نہیں۔ خدا نے مجھے اس دنیا میں بیچج کر بڑی غلطی کی۔ وہیں آگ میں جھونک دیتا تو میں اس کی رحمت کی قائل ہو جاتی۔“

ایک سادہ دہقانی نوجوان عورت کو ایسی گہری گہری باتیں کرتے دیکھ کر میں بھونپ کا سارہ گیا۔ میں نے اسے اصل مقصد کی طرف لے جانا چاہا۔

”آپ کسی بڑے زمیندار کی صاحبزادی معلوم ہوتی ہیں؟“

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی اور سکراتے ہوئے بولی۔ ”آپ یہی خیال فرمائیں۔ میرے باپ کے کھیت حدگاہ تک پہلی ہوئے ہیں لیکن روح کے کرب میں انہوں نے کمی کی بجائے اضافہ کیا ہے۔ میں غریب ہوتی تو با اختیار ہوتی۔ امارات انسان کو بے دست و پا کر دیتی ہے۔ میں پڑھی لکھی بھی ہوں۔ وہیں ہمارے قبے میں ایک مل اسکول ہے۔ جو تھوڑا سا علم حاصل کیا وہ بھی مصیبت ہو گیا۔ علم نہ ہوتا تو احساسات اور امیدوں کی وسعت اس قدر خوفناک نہ ہوتی۔ جہالت بڑی نعمت ہے حضرت! کل ایک جاہل بوڑھا زمیندار ایک جوہر میں اپنی بھیڑوں کو نہلا رہا تھا اور گارہ تھا۔ انسان ایک پچھی ہے جو اپنے پرانے پر جھاڑ کر پہاڑوں کے ورے چلا جاتا ہے اکیافنا کا نقش اس حسن اس نزاکت سے آپ سمجھتے ہیں؟“

میں نے اپنے چہرے پر سے پینے کے قطرے پوچھتے ہوئے کہا۔ ”نہیں،“

وہ خاموش ہو گئی۔ مجھے یہ تو معلوم ہو چکا تھا کہ یہ عورت بڑی دکھیا ہے لیکن اب میرے دل میں اس کی کہانی سننے کی خلش تھی۔

”آپ سوچیں گی یا مجھے کچھ اپنا حال سنائیں گی؟“

”اپنا حال سناؤں گی۔“ مجھے بڑا لطف آ رہا ہے۔ مدت کے بعد میں نے زبان کھولی ہے۔ یہ آپ کے بستشوں کا اثر تو نہیں؟“

میں زور سے نہسا! وہ بھی مسکرائی۔ اتنے درد اور اتنی غمناک فضائیں ایسا انوکھا مذاق! زمیندار لوگوں کو تو پڑھے لکھے جاہل کہتے ہیں!

”میں نے آٹھ جماعتیں پاس کیں۔ ایک دن میں نے ایک نوجوان کو دیکھا جو اسکولوں کے انکشہر کا لڑکا تھا۔ باپ کے ہمراہ ادھر سیر کو آ لکھا تھا۔ مجھے دکھ کروہ لٹکھ کا اور آنکھیں مل کر آ گے بڑھ گیا۔“

”میں نہیں بتاسکت کہ مجھے کیا ہوا۔ بس یوں معلوم ہوا جیسے کسی نے میری روح کو تھیلیوں میں دبا کر اس قدر ملا ہے کہ اب اپنی

اصلی حالت پر آنے کی جدوجہد میں وہ لاکھوں ٹیسروں کا مرکز بن رہی ہے!

”وہ ایک ہفتہ ہمارے قبے میں رہا۔ میرا بھائی چونکہ ایک اسکول میں استاد تھا اس لیے ہم نے بھی ان سپر کا لکھنا پا کیا۔ وہ نوجوان بھی ہمارے گھر آیا۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہاتھ سے لقہ چھوٹ کر اس کے کپڑوں پر جا گرا۔ بے چارے کو بڑی خفت اٹھانی پڑی!
”ہفتے کے بعد وہ وہاں سے چلا گیا۔ اس کے بعد مجھ پر جو گزری وہ آپ سوچ سکتے ہیں۔ یہ باتیں بھی ہوتی جا رہی ہیں اور آپ کو تو شاید نہیں بھی آ رہی ہے؟“

”نہیں نہیں آپ کہتی جائیں۔“

”مینے کے بعد وہ اکیلا ہی ہمارے قبے میں آیا اور ہمارے ہاں تھہرا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”یہاں کی آب و ہوا چھپی ہے۔ میں نے سوچا ایک ہفتہ اور گزر آؤں۔“

”باپ نے تو اس کی خوب خو شامد اور خاطر مدارات کی اور یہی وجہ ہے کہ آج کل میرا بھائی ضلعے کا افسوسنگر ہے۔ خیر! ایک دن اس نے مجھے تھہرا کر کہا۔ ”پانی پلا دیجئے ذرا۔“

”میں پانی لے آئی اور اس نے مجھے کچھ عجیب طرح دیکھا۔ اس کے بعد وہ سات دن کی بجائے دس دن رہا اور جب جانے لگا تو اس کے آخری الفاظ یہ تھے۔ ”پیاری میں صرف تمہارا ہوں۔“

”آپ ہماری محبت کی تدریجی ترقی کا اندازہ خود لگائیں، یہ اس کے آخری الفاظ تھے۔ ”میں صرف تمہارا ہوں۔“ یہ الفاظ کیسے کیے عجیب پیرا ہوں میں میرے سامنے آئے۔ میں نے امیدوں اور آنے والی مسرتوں کی ایک بہشت آباد کر لی تھی! وہ مجھے اپنی ایک تصویر بھی دے گیا تھا۔“

میں نے دفور شوق میں تیزی سے پوچھا۔ ”آپ کے پاس موجود ہے اب؟“

”میں نے دریا میں بھاولی تھی۔“

میرا دماغ بھنا گیا!

”اس کا نام یاد ہے اپ کو؟“

”انورا!“

میرا خون کھول اٹھا۔

”اور آپ نے اس کا فنڈو دریا میں بھاڑایا؟“

”آپ سچے تو کہی۔ میں نے ایک سال اس کا انتظار کیا۔ آخر اس کا باپ خود آیا۔ وہ خود نہ آیا۔ میرے باپ نے اس سے پوچھا۔ ”انور کیوں نہیں آیا؟“

”وہ بولا۔ ”اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت جارہا ہے۔ چار پانچ دنوں کے بعد کراچی سے جہاز پر سوار ہوگا۔“

”میرے باپ نے مذاق کے طور پر پوچھا۔ ”کوئی میم ویم نہ لے آئے ولایت سے؟“

”انپکٹر نے جواب دیا۔ ”میم ویم کیا لائے گا۔ شادی تو کر لی ہے اس نے!“

”اس کے بعد مجھے کچھ معلوم نہیں۔ آج شام کو میں انھی ہوں تو ماں میرے سرہانے بیٹھی تھی۔ میں نے کہا۔ ”ماں مجھے کیا ہو گیا؟“

”بولی تم ہے ہوش ہو گئی تھیں۔ مجھے آہستہ آہستہ سب واقعات یاد آنے لگے۔

”میں نے ماں سے کہا۔ ”اب میں اچھی ہوں۔“

”وہ بے چاری خوش ہو گئی۔ باہر فکر مند باپ بیٹھا تھا۔ اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔

میں نے سوچا ذرا باہر گلی میں پھر آؤں دماغ کا بوجھہ بلکا ہو جائے گا۔ میں دریا کے کنارے چلی گئی۔ انور کی تصویر نکالی، اس کی شہریہ کاغذ پر سے انٹھ کر اوپر اڑانے لگی اور دورافت پر جا کر میرا منہ چڑانے لگی۔ میں نے گھبراہٹ سے پلکیں جھکا گئیں تو تصویر جیسے مکرا دی۔ میں نے اسے غھٹے میں لہروں کے حوالے کر دیا۔ قبے والوں سے انکھے بچا کر اوہر چل پڑی کہ ولایت جانے سے پہلے اس سے ایک بات تو کروں۔ عورت سے وعدہ کر کے اس کے خلاف ورزی کرنے کی وجہ تو پوچھ لوں۔ میں حق بجانب ہوں گا؟

”میں نے کہا۔ ”ضرور۔“

”بس یہ میری کہانی ہے۔“

اس دوران وہ بدستوروتی رہی۔ آنسو اس کے سینے پر گرتے رہے اور اس کی قمیش اس کے جسم سے جگہ جگہ چھٹ گئی۔

آخر میں نے کہا۔ ”وہ انور آج صبح یہاں مجھ سے ملنے آئے گا۔ وہ میرا دوست ہے۔“

اس کی آنکھیں چمک انھیں۔ چادر پھر اس کے سر سے کھسک گئی اور وہ پھر یونانی صنمیات کا ایک بے مثل مرمریں شاہکار بن کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔

”یہاں آئے گا؟ کس وقت؟“

”صحیح مجھ سے مل کر کراچی چلا جائے گا۔ آپ رات یہاں بس رکریں۔ صحیح میں اس سے بات کروں گا۔“

اس نے اپنی کمر پر ہاتھ رکھ کر کسی چیز کو نہ لتے ہوئے کہا۔ ”میں خود کروں گی، میں خود کروں گی۔ آپ بے فکر رہیں۔“

میں نے اس کے لیے بستر بچایا اور جب میں اپنا کمبل اور کھات اٹھا کر باہر جانے لگا تو وہ بولی۔ ”میں آپ کی بے حد منون ہوں، آپ باہر سور ہے ہیں۔ آپ کو تکلیف تو ہو گی مگر مجھے نیند نہیں آتی اور ایک کو نیند نہ آئے تو دوسرا بھی مشکل سے سوتا ہے۔ میں آپ کی بے حد منون ہوں۔“

میں سکرایا اور باہر چلا آیا۔

صحیح اٹھ کر میں اندر گیا تو اس کے بستر کو خالی پایا۔ خوب صورت اجنبی عورت کا کوئی نشان نہ تھا۔ میں گھبرا سا گیا۔ میں نے سوچا ہے چاری ٹنگ آ کر گھر چلی گئی ہو گی۔ عورت میں جذبات زدہ ہوتی ہیں۔ لمحے بھر کے لیے بلبلے کی طرح ابھرتی ہیں اور پھولتی ہیں اور پھر بیٹھ جاتی ہیں۔

سورج ابھر آیا لیکن انور کا کہیں نشان نہ تھا۔ کھانے کے وقت میرا نوکر بجا گا بجا گا آیا اور چلا اٹھا۔ ”حضور آپ کا دوست راستے میں مرا پڑا ہے!“

میرے اوسان خطا ہو گئے۔ جوتا پہنے بغیر وہاں سے بھاگا۔ نوکرنے راستے کے کنارے گھاس پر ایک لاش کی طرف اشارہ کیا جس پر اسی اجنبی عورت کی میلی چادر پڑی تھی!

میں نے جاتے ہی چادر اٹھا کر دیکھا تو ایک خیخراں کے کلیچے سے پار ہو چکا تھا!

بارہ سال گزر گئے ہیں لیکن اس اجنبی عورت کا کوئی پتہ معلوم نہیں ہوا۔ کہتے ہیں پورب کے پہاڑوں میں کوئی روح اندر ہیری راتوں میں یہ گیت کا یا کرتی ہے۔

”انسان ایک پنچھی ہے جو اپنے پرانے پر جھاؤ کر پہاڑوں کے پرے چلا جاتا ہے۔“



آرام

بوزھا علیا اپنے پرانے گھر کی جگلی ہوئی دیوار سے پینچھے لگائے حقے کے کش لگا رہا تھا۔ اس نے چشم میں ابھرے ہوئے تمبا کو کو آنکھی سے دبایا۔ پھر آنکھی کوتہ بند سے پونچھا۔ ایک اور بہت لمبا کش لگایا اور اس زور سے کھانا کہ اس کی زرد و خندلی آنکھوں میں ہلکی ہلکی سرخی سی دوڑ گئی۔ کھانے سے فارغ ہو کر اس نے حقہ پرے رکھ دیا اور گھنٹوں پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے دماغ میں خلشی ہونے لگی اور یکا یک وہ اپنے آپ کو ایک کم من بچ سامنے محسوس کرنے لگا جس کے پاؤں پچھر سے بھرے ہوں اور سر کے بال گروہ غبار سے میالے ہو گئے ہوں۔

وہ سوچنے لگا کیا ہی اچھا زمانہ تھا! کتنے ہلکے ہلکلے دن تھے اور کتنی ذرا ذرا سی رات تھیں! آنکھیں بند کیں، کروٹ بدھی اور پوچھنے لگی۔ ندی میں ڈبکی لگائی، آنکھ چھوٹی کھیلے اور سورج مغربی پہاڑوں میں ڈوب گیا۔ تن پر کپڑا نہیں تو نہ سکی دودوں سے منڈپیں دھو یا تو کیا پروا! کبھی اس گلی میں جا رہے ہیں، کبھی اس چھت پر چڑھ رہے ہیں، کبھی اس مسافر کے پیچھے سماں چھوڑ دیا، کبھی اس فقیر کے پیچھے نوج لیے۔ کبھی ماں سے گز کی بھیلی چھین کر ہڑپ کر گئے۔ کبھی ابا کے ہل کی ہستھی پر کچھ تھوپ دیا! وہ گھریاں کتنی رسیلی گھریاں تھیں! پھر اچاک کا ندھے پر ہل رکھ دیا گیا۔ آگے آگے ہل چھوڑ دیے گئے۔ دن ذرا لمبے ہو گئے اور رات میں چھوٹی! دو پھر کو پتھی زمین میں نگلے پاؤں ہل چلانا اور باجرے کی روٹی کے ساتھ پتھی پتھی چھا چھوڑ جس میں نمک تک نہ ہوتا تھا اور چار دن تو منہ بنایا تیوری چڑھائی، ہونٹ لٹکائے، ماں سے بولنا چھوڑ دیا، ابا کا حقد تازہ کرنا بھول گئے لیکن آہستہ آہستہ اس کام میں بھی لذت محسوس ہونے لگی۔ مسکین بیلوں کے پیچھے پیچھے ہل کی ہستھی پر ہاتھ جما کر ایک محمد در قبے میں چکر کا شنا اور پھر ساتھ ہی ایک گیت گنگنا تے جانا۔ مٹی کو ادھر ادھر پھیلتے ہوئے دیکھتے رہنا! آخر اسی کام میں اظف حاصل ہونے لگا!

اور وہ دن کتنا پیارا دن تھا جب چنوں پہلی بار مجھے ملی۔ میرے پاس آئی اور کہنے لگی۔ ”علیا! تمہاری ماں کسی کام پر جا رہی تھی۔ مجھے سے کہنے لگی۔ ”بھائی کی طرف جاتے ہوئے علیا کے لیے بھی چھا چھا اور روٹی لیتی جانا۔“

”کہاں رکھوں؟“

”مجھے دے دے۔“

میں مل چھوڑ کر اس کی طرف آیا اور روٹی لے کر ایک جھاڑی تلے رکھ دی۔ وہ جانے لگی۔ میں نے یوں ہی پوچھ لیا۔ ”چنون تیرا بھائی کہاں مل چلا تا ہے؟ میں نے تو اسے اس طرف سمجھی تھیں دیکھا۔“

وہ بولی۔ ”اس پر لی راہ سے گزر کر اس ڈھیری کے ورے مل چلا تا ہے۔ اب وہ میرا انتظار کر رہا ہو گا۔“
میں نے کھانا کھایا اور بیلوں کو چھکل دے کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

اس دن میں گھروالپس آ رہا تھا کہ چنون مجھے گلی کے نکڑ پر ملی اور ملتے ہی مسکرا دی۔ میں یہ سمجھا کہ وہ کوئی بات کرے گی لیکن وہ صرف مسکرا لی اور آگے نکل گئی۔ ایک دفعہ اپنی چادر سنبھالتے ہوئے اس نے مجھے یوں ہی دیکھا اور میں ایک کھار سے ٹکراتے ٹکراتے بچا جو سر پر برتنا اٹھائے پر دیکھ جا رہا تھا۔ رات کو مجھے ذرا دیر سے نیندا آئی۔ کرو میں بدلتے بدلتے شانے چھل گئے۔ ماں شاید جاگ رہی تھی۔ پوچھنے لگی۔ ”کیا بات ہے علیا، ابھی تک سویا نہیں؟“
میں نے کہا۔ ”نیندا نہیں آتی۔ ماں“

وہ بولی۔ ”آج والی میں مر جیں کچھ زیادہ تھیں اس لیے مجھے بھی نیندا نہیں آتی۔ تمہارا باہما تو مزے سے سورہا ہے۔“
میں نے تاریک آسمان پر نئے نئے تاروں کو گننا شروع کر دیا اور گنتے گنتے سو گیا!
ایک ہفتہ بعد میں صح صح اپنے کھیت میں آیا تو دور ہماری بیری پر کوئی بیٹھا مزے سے بیکھار رہا تھا۔ میں بتل وہیں چھوڑ کر گالیاں دیتا ہوا ادھر بھاگا۔

ورخت کے نیچے پہنچا تو دیکھا کہ چنون ایک ٹھنپی سے چھپی ہوئی کانپ رہی ہے۔ نہ جانے کیوں میں سنائے میں آگیا۔ میری زبان گنگ ہو گئی۔ میں چنون کی طرف دیکھے بغیر مڑا اور اپنے کھیت میں آگیا۔ میں سارا دن اپنے آپ کو کوتارہا۔ چار بیرون کے لیے میں نے اس کے سارے خاندان کو بر اجلا کھا رہا تھا۔ اور وہ بے چاری کتنی ڈھری تھی! اس کی بھوولی بھالی گھری گھری کالمی کالمی آنکھیں کتنی پیاری ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ زبان سے نہیں بلکہ آنکھوں سے بولنے والی ہے۔ میں کتنا برا شخص ہوں، کتنا کمینہ اور بے حوصلہ!

میں مل چھوڑ کر بیری کی طرف گیا۔ بیرون کی اچھی خاصی گلخانی باندھ کر لے آیا اور گھروالپس جاتے وقت چنون کے مکان کے قریب سے گزر۔ وہ سجن میں مرغیوں کو دانہ کھلا رہی تھی۔ میں اندر چلا گیا۔ اس کی ماں چولھے کے پاس بیٹھی ہندیا دھورہ ہی تھی۔
”لوخالہ! آج یوں ہی خیال آ گیا کہ آپ کو اپنی بیری کے بیرون کھلا لیں، نخاخانو خوش ہو جائے گا۔“

وہ بہت خوش ہوئی۔ اندر سے چنگیر لے آئی اور سب بیراں میں ڈال لیے۔ پھر مسکراتی ہوئی بولی۔ ”تم بہت اچھے ہو علیا! تمہاری ماں کہتی تھی کہ علیا بس بھولا بھالا انجان ساڑھا کا ہے۔ تم تو اچھے خاصے سیانے جوان ہو۔ جواب نہ پرانے کی تحریر کر لئے اسے بھولا کون کے؟“

واپس جاتے وقت میں نے چنوں پر ایک اچھتی ہوئی نظر ڈالی۔ وہ بے چاری حیران ہو ری تھی اور اس تیزی سے پلکنیں جھپکا رہی تھیں جیسے آنکھوں میں کوئی تنکا پڑ گیا ہے! اس رات میں بہت آرام سے سویا۔

وہ دن بعد مجھے چنوں پھر کھانا دینے آئی۔ ”تمہاری ماں پانی بھرنے جا رہی تھی۔ بولی آج علیا کی روٹی تم لیتی جاؤ۔“ میں نے کہا ”میں لیتی جاؤں گی۔“

اس نے جہاڑی کے پاس چھاچھا کا برتن رکھ کر اپر روٹی دھردی۔ میں نے پوچھا۔ ”چنوں، تم اس دن بہت خفا ہو گئی تھیں تاً، اصل میں مجھے یہ معلوم ہی نہ تھا کہ پتوں میں چنوں چھپی ہے ورنہ میں خود اپر چڑھ کر ساری شہنیاں جھلک دیتا!“
وہ مسکرائی۔ اس نے گردن جھکائی۔ میں نے چاہا کہ بچوں کی طرح ناچوں کو دوں۔ میں نے زور سے آنکھیں ملیں اور جب سامنے دیکھا تو وہ ڈیمیری کے موڑیں جاری تھیں۔

ان دنوں مجھے کوئی بچہ بھی روتا نظر آتا تو میں اس کا گاگھونٹنے پر سل جاتا۔ میں دنیا کی ہر چیز کو مسکراتا اور قبیلے لگاتا دیکھنا چاہتا تھا۔ ان ہی دنوں میں نے کبڈی کے کھیل میں علاقے کے اچھے اچھے کھلاڑیوں کو یوں سر سے اوپر اٹھا کر زمین پر پھینکا کہ بڑے بوڑھوں کے مند کھلے کے کھلے رہ گئے۔ بے خبری میں گاؤں کے ضعیف العردھوپی کی نسوار کی ذیباالت گئی۔ اس نے کہا۔ بھی اتنی عمر گزر گئی۔ ان آنکھوں سے تو کیا خواب میں بھی ایسا پہلوان دیکھنے میں نہیں آیا۔ اللہ اللہ! اچھے اچھے جوانوں کو یوں سر سے گھما کر پھینکتا ہے جیسے سب صابن کے جھاگ کے بنے ہوئے ہیں!

”اس دن میں اپنے دوستوں کے کاندھوں پر سوار گاؤں کی گلیوں میں سے گزر رہا تھا تو مجھ کو دیکھنے کے لیے چنوں اپنی سہیلیوں کے ساتھ چھپت پر چڑھ گئی۔ اور جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو میرا دل اس زور سے دھڑکا جیسے بل کی چھال کے ساتھ پتھر نگرا جاتا ہے۔

جس دن چنوں سے میری ملکنی ہوئی اس دن میرے جسم سے اس قدر پسینہ نکلا کہ میرے کپڑے بھیگ گئے۔ آخر ایک روز میں

گیت گاتا اور زمین کا سینہ چیرتا اڑا پھر تا تھا کہ کسی پتھر سے مل کی پھال مزگنی اور پتھنی نوٹ کر پرے جا پڑی۔ میں ہاتھوں کے مل زمین پر آ رہا۔ اندر رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے آواز دی۔ ”علیا۔ علیا بھائی!“

چنوں کا بھائی خانوکھڑا اور رہا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ”ارے روکیوں رہا ہے؟ روکیوں رہا ہے خانو؟“

”چنوں مر گئی!“

میرے سینے سے اسی آواز آئی جیسے بارود سے کوئی پتھر نوٹ جاتا ہے۔ داغ تپ گیا، نبضیں ڈوبنے لگیں۔ ”چنوں مر گئی!“

پھر میں نے بڑی مشکل سے اسے سے پوچھا۔ ”کیسے؟“

”بجورے بیل نے سینکوں پر اٹھا کر فرش پر دے مارا اور وہ مر گئی!“ وہ بے اختیار رونے لگا۔

میں بیل اور بیل وہیں چھوڑ کر بھاگا۔ چنوں کے گھر کا رخ کیا لیکن پھر مر کر اپنے گھر پہنچا۔ دروازے مغلل تھے۔ باہر کھاث پر اک کتیا پڑی اونگھری تھی۔ میں دیوار سے پینچھے لگا کر بینچے گیا۔

چار پانچ سال بعد میں چنوں کو بھول گیا۔ میں کتنا بے حیا اور بے غیرت انسان ہوں۔ میں چنوں کو بھول گیا۔ ایک اور لڑکی سے میری شادی ہو گئی۔ پھر میرے بیٹے ہوئے۔ گھر آباد ہو گیا۔ والدین بھی مر کر بھولے بسرے ہو گئے۔ اک دن چشمے کے پانی میں اپنا چہہ دیکھا تو معلوم ہوا کہ داڑھی اور کنپیوں کے بال سفید سے ہو گئے ہیں۔ قحط پڑا۔ دوپھے مر گئے اور دو فوج گئے۔

وہ اب جوان ہو گئے ہیں۔ چارہ کائے جاتے ہیں۔ رات کو آ کر میرے پاؤں داجتے ہیں، میرا سر سہلاتے ہیں مگر ان کی بہن اداس سی رہتی ہے۔ اس دن نور خان کا لڑکا یہر دینے آیا تو خدا جانے مرغیوں کو دانہ کھلاتے کھلاتے اس کا ہاتھ کیوں رک گیا تھا! کھوئی کھوئی سے رہتی ہے! موسم ہی ایسا ہے! قاعدہ ہے ا موسم بدلنے لگے تو طبیعت مخصوصی رہتی ہے۔

اب مجھے کتنا آرام ہے۔ بچپن گزر گیا، مل چلانے کے دن گزر گئے! چنوں مر گئی۔ بے چاری بھولی بھالی لڑکی! نہ مرتی تو آج وہ بھی میری طرح بوڑھی ہوتی! اس کے بعد شادی بھی ہو گئی۔ بچے بھی جوان ہو گئے۔ اب آرام ہی آرام ہے، نہ کوئی کام ہے، نہ کوئی فکر ہے۔ مزے سے زندگی گزر رہی ہے۔ لطف سے دن کث رہے ہیں۔ چنوں یادنہ آتی تو یہ مزے اور یہ لطف مکمل ہوتے۔ پھر بھی ضرورت کے بغیر دلمیز سے باہر قدم تک نہیں رکھتا۔“

”علیا! او علیا! سو گیا ہے کیا؟“

بوز ہے علیا نے اپنا سرگھٹنوں پر سے اٹھایا۔ اس کی دھندلی دھندلی آنکھوں میں آنسو تھے۔ الجھی ہولی واڑھی میں بھی بہت سے
قطرے انک رہے تھے۔ ”انھو تھانیدار صاحب کا بسترا اٹھا کر تھانے لے جاتا ہے، جلدی انھو۔“

”نمبردار جی جیسی؟ بسم اللہ!“

بوز ہما آنسو پوچھے بغیر اٹھا اور نمبردار کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ پھر چوپال کی طرف مڑ گیا!



وہ جا چکی تھی

اوے پڑے۔ بے چارے مہرو کاریوڑ باہر تھا۔ غریب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بکریوں نے کہاں پناہی ہوگی۔ ایک ایک اولاً اخروٹ سے بھی کچھ بڑا ہی تھا۔ اس کی کمزور جھونپڑی کی چھت تک جھک گئی تھی۔ اب اوے بند ہو گئے تھے۔ ننھی ننھی بوندیاں پڑ رہی تھیں۔ وہ ہاتھ میں چھاؤڑا لے کر چھت پر گیا اور آن کی ان میں منوں بوجھ دہاں سے ہٹا دیا۔

گاؤں کی تمام چھتیں اور گلیاں اولوں سے پٹی پڑی تھیں۔ ہر طرف خاموشی طاری تھی۔ کچھ آدمی چھتوں کو صاف کر رہے تھے۔ مہرو نے آسان کی طرف دیکھا، بادل کے چھٹنے کے کوئی آثار نہ تھے۔ اور اس کی غریب بکریاں! کاش وہ اپنی بیمار بہن کو پوچھنے نہ آتا! کاش وہ شام کو بکریوں کو ساتھ لے کر بے فکری سے گھرا بیٹھتا۔ ماں بہن کی چٹی و پکار سے بے پرواہ کر اس نے لاخی ہاتھ میں لی اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا نڈمنڈ درختوں کے جھنڈوں سے اس پار کھیتوں کی وسعتوں میں غائب ہو گیا۔

مہرو دو میل تک اولوں کو رومندا ہوا چلا گیا مگر اس کی بکریوں کا کہیں نشان نہ ملا۔ اگر وہ زندہ نہ تھیں تو کم از کم ان کی لاشیں تو ملتیں۔ دو تین گھنٹے وہ ماراما را پھر تارہا، آخر دور سے اسے ایک جھونپڑا نظر آیا جس کے دروازے پر دو بچے کھڑے اولوں کو منہ میں رکھے چوس رہے تھے۔ مہرو کے ہاتھ پاؤں تھے ہو گئے تھے۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ ہونٹ نیلے اور چیرہ زرد ہو گیا تھا۔ وہ ان بچوں کے پاس آ کر رکا اور جھک کر بولا۔

”کہیں کچھ بکریاں دیکھی ہیں تم نے؟“

دونوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ ”ہاں“

پھر دونوں ”اماں“ کہتے ہوئے اندر بھاگ گئے۔

کچھ دیر بعد ادھیر عمر کی ایک عورت دروازے پر نمودار ہوئی۔ اس کے آٹے سے بھرے ہوئے ہاتھوں کو دونوں بچوں نے تھام رکھا تھا۔ وہ آتے ہی مسکراتی اور کہنے لگی۔ ”فلکرنہ کرو بیٹا،“ میں نے تمہارا سارا ریوڑا ایک کوٹھے میں بند کر دیا ہے کسی کو بھی نقصان نہیں پہنچا۔ اگر میری بیٹی مجھے خبردار نہ کر دیتی تو تمہارا ریوڑ تباہ ہو جاتا۔ وہ سامنے مکان ہے نا! وہاں چلے آؤ، میری بیٹی وہیں ہو گی۔ ہشیار رہا کرو بیٹا! اگر جتنے والے بھورے بھورے بادل اوے بر ساتے ہیں۔ اچھے اچھے قیل پھر ک جاتے ہیں، غریب بکریوں کی کیا بساط؟“

”آپ کی مہربانی ہے ماں! میں تو تھک ہا رکر ما یوس ہو گیا تھا۔“

”آؤ ذرا آگ تاپ لو۔ تم کس قدر کا نپ رہے ہو! بھوکے ہو گے تم! ایک دل قتے کھایا۔ آؤ آؤ نا! اور تو خانو! تو اپنے بھائی کو مٹھی بھر پھنے تو دے دے!“

نخے پنچ نے دابنے ہاتھ سے جیب ٹولتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تو جیب ہی نہیں ملتی ماں!“

”میں آگ تاپتا مگر بہن کی فکر ہے۔ بکریاں لے کر گھر چلا جاؤں گا!“

”تمہاری بہن یہاں ہے؟ خدا حرم کرے۔ میری طرف سے اسے پوچھنا۔“

”بہت اچھا۔“

خانو سے مٹھی بھر پھنے لے کر مہرو اس مکان کی طرف چل پڑا۔ دروازے پر لڑکی اس کی طرف پینچ کے بیٹھی تھی۔ یہاں ایک مہرو کے کافنوں میں ایک رسیلی سی آواز آئی۔ لڑکی دھمکی دھمکی لے میں گا رہی تھی۔

آئی گزریاں ڈھنے سجناء دے دل ماہیا

تیری میری یاری ندیاں جیر کے مل ماہیا

(ماہیا) جو آفت آئے گی برداشت کروں گی۔ میں نے اپنے دوست کو پر کھلایا۔ تجھے میں اور مجھے میں محبت ہے اس لیے ندیاں نالے پھاند کر مجھے مل جاؤ!

مہرو کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ سر میلی دکھ بھری آواز اس کے کافنوں کے رستے اس کی روح میں پہنچ کر ایک احتل پتھل سی برپا کر رہی ہے۔ بے خبری میں اس کے ہاتھوں سے لاٹھی گر گئی۔ لڑکی نے پلت کر مہرو کی طرف دیکھا اور بجا کر سر جھکا لیا۔ مہرو اپنی بکریوں کو بھول گیا۔ لڑکی کی ما یوس نگاہیں ما یوس لے اور ما یوس جذبات اس کے تصورات میں یہ جان سا پا کرنے لگے۔ مہرو نے لاٹھی اٹھائی اور لپک کر دروازے تک پہنچ گیا۔ لڑکی کھڑی ہو گئی اور اپنی کھدر کی چادر کو اپنے گرد پیشی ایک طرف ہو گئی۔ مہرو کی نگاہیں اس کے معصوم سادہ چہرے پر گز گئیں۔ بکریاں اپنے آقا کو دیکھ کر باہر دوڑی آئیں۔ دو ایک تو اس کے جسم سے اپنا ماتھا بھی رگڑنے لگیں مگر مہرو لڑکی کے پا کیزہ کشادہ ماتھے کی مقدس تمتاہٹ میں ڈوب گیا تھا۔ یہاں ایک لڑکی نے اپنا سراخھایا۔ وہ حیران تھی کہ نووار دنے ابھی تک اپنا مطلب کیوں ظاہر نہیں کیا۔ اس کے لیے بالوں کی دلیں اس کے رخساروں کو چھو چھو کر لہر ارہی تھیں۔

اس نے سر جھکائے ہوئے پوچھا۔ ”بکریاں آپ کی ہیں؟“

مہرو چاہتا تھا کہ اپنے جذبات کو الفاظ میں تبدیل کر کے لڑکی کے سامنے رکھ دے مگر وہ ناکام رہا۔
اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”میری ہی ہیں۔“

وہ کانپ رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار ایک دو شیزہ اس کے اتنے قریب کھڑی تھی۔
لڑکی نے کمزوری آواز میں کہا۔ ”تو پھر اپنا مال سنجاں لیجھے۔“
”مہربانی!“

لڑکی نے جو تیوں سے ایک دو نیخے سے اولے نکال کر باہر پھیٹے اور چل دی۔ مہرو دیر تک اسے دیکھتا رہا اور جب وہ اپنی جھونپڑی کے قریب پہنچ گی تو اس نے مذکور مہرو کی طرف دیکھا۔ وہ لڑکھڑا گیا مگر لاٹھی کا سہارا لے کر سنجلدا اور یہ گیت کاتا ہوا بکریوں کے پیچھے ہو لیا۔

”تیری میری یاری ندیاں چیر کے مل ماہیا!“ وہ سر جھکائے گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ نیم کی ٹوٹی ہوئی ٹھنڈیوں سے لٹکے ہوئے چڑیوں کے گھوٹسلے اس کی توجہ اپنی طرف نہ کھینچ سکے۔ کئی چڑیاں اور چیلیں گھونسلوں میں پہنچنے سے پہلے ہی الوں کا شکار ہو کر جھاڑیوں میں اُنکی پڑی تھیں۔ اور کئی ابھی تک ٹوتے ہوئے پروں کو بے تابی سے پھر پھر اتی کھیتوں کی مینڈھوں پر ریگنگی جاتی تھیں۔ گیہوں کے فو خیز پودے الوں کے لامتناہی سمندر سے سرنکالے جانے کے جھانک رہے تھے۔ بادل مغرب کی طرف بہے جا رہے تھے۔ افق کے پاس کبھی کبھی بچلی بھی چمک اٹھتی تھی۔ مہرو چلتا گیا، سر جھکائے لاٹھی دیکھتا ہوا ایک بیکھے ہوئے بیکس پر دیسی کی طرح جوانا زادراہ قزاقوں کے حوالے کر چکا ہو۔ آخر وہ گھر پہنچا۔

”مہروا!“

اس کی ماں دروازے سے بھاگتی ہوئی آئی۔ اس کے سر کے بال برف کی طرح سفید تھے اور آنکھوں کے کناروں پر لاتھداد جھریاں تھیں۔ اس نے دوڑ کر مہرو کا بازو پکڑ کر دبایا۔

”سردی تو نہیں لگ رہی؟“ ٹھکر ہے بکریاں مل گئی ہیں بیٹا! اس بیچ گئی ہیں نا؟ جیتے رہو۔ دیکھو تمہیں خاتون یاد کر رہی تھی۔“

مہرو نے ایک مظلوم کی طرح ماں کی طرف دیکھا اور پکھے بے بغیر اندر چلا گیا۔ اس کی ماں کو کیا معلوم تھا کہ اس کا آزاد کھلنڈڑا ایٹا آج خدا کی جسمیں ترین تخلوق سے دوچار ہو کر اپنی روح کو جاودا نی شکنجوں میں جکڑ بیٹھا ہے۔ اس کی بیمار بیبن نے پہ مشکل سراٹھا کر اسکی طرف دیکھا اور مستفرانہ انداز میں اپنی باریک بھنوں اپنی بیمار اور اداس آنکھوں پر جھکا دیں۔

مہرو نے اپنی چار پانی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”سب بکریاں مل گئی ہیں۔“
”مشکر ہے۔“

بیمار بہن کے ہونٹ سرت سے کانے پر زردی میں قدرے اضافہ ہو گیا، نازک سوکھے ہوئے ہونٹوں کے معصوم گوشے ایک لمحے کے لیے متھر ہوئے اور پھر مل گئے۔

اس نے پوچھا۔ ”تم نیمار ہو بھائی؟ تم خاموش کیوں ہو؟“

مہرو کو یہاں ایک اپنی حالت کا احساس ہوا۔ وہ سنجھل کر اٹھا۔ لامھی ایک کونے میں رکھ دی۔ چھاتی کو بے تابی سے ملا اور بہن پر جھک کر کہنے لگا۔ ”نہیں میری اچھی بہن! میں کیوں بیمار ہونے لگا۔ بس سردی کی وجہ سے قدرے چپ ہو گیا تھا۔ کھواب کیا حال ہے؟ کھانی تو بہت نہیں آئی؟ اب تھیک ہونا؟“

”کیا بڑاؤں بھیا، کھانتی ہوں تو ملکیجہ سست کرٹئے گلتا ہے۔ دل رک کر کاپتا ہے۔ تم مجھے مار کیوں نہیں دیتے بھائی، تم میرا گلا کیوں نہیں گھونٹ دیتے؟ تم“

اچانک ماں نے اندر آ کر خاتون کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور ٹھیکین آواز میں بولی۔ ”ایسی باتیں نہ کہا کرو بیٹی، میرا دل دکھتا ہے۔“ تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیے۔ خاتون نے کروٹ بدل کر چادر سے آنسو پوچھے، بوڑھی نے آنکھیں مل دیں اور بد نصیب مہرو پانی پینے کے بھانے ایک کونے میں جا کر جی بھر کر دیا۔

دوسرے دن مہرو سویرے سویرے اٹھا اور یہ کہہ کر بکریوں کا باڑے سے نکال کر چل دیا۔ ”آج میں شام سے بہت پہلے آ جاؤں گا۔ مجھے بہن کا فکر رہتا ہے۔“

”ماں نے اس کی گپڑی کے کونے میں ایک باری روٹی اور ایک پیاز باندھ دیا۔ وہ بکریوں کو سیدھا اسی مکان کی طرف لے گیا جو رات بھر اس کے تصورات میں منڈلا کر اس کی نیند حرام کرتا رہتا تھا۔ گلی زمین پر بکریوں کے نخنے سموں کے لاتعداد نشان پڑتے جاتے تھے۔ کہیں کہیں جھاڑیوں کے ارگردیا کسی بڑے پتھر کے سامنے میں نخنے نخنے اولوں کا ایک انبار سا بھی نظر آ جاتا تھا۔ بے چاری بے زبان بکریاں مڑ کر آتا کوئی بختی تھیں اور آگے چل دیتی تھیں۔ وہ کیا کھاتیں؟ خاک! گھاس کے اکا دکا جھکے ہوئے تنکوں پر بھی نیخ کی ہلکی ہلکی تہہ جھی تھی۔ یکا یک مہرو رک گیا۔ سامنے سے وہی لڑکی آ رہی تھی۔

اس نے پوچھا۔ ”کہاں جا رہی ہو تم؟“

”بس بیہین تک آئی تھی۔“
”کس لیے؟“

”ماں پوچھتی ہے تمہاری بہن کا کیا حال ہے؟“
”کمزور ہو گئی ہے بے چاری۔ اچھی ہو جائے گی۔“
”ماں کہتی ہے میری طرف سے اسے پوچھنا۔“
”اچھا۔“

لڑکی زمین پر نگاہیں گاڑے کھڑی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اس سے سوال کرتی جائے اور وہ جواب دیتا جائے۔ لڑکی پلٹ کر جانے لگی۔ وہ مر نے کوتومزی مگر اس کے پاؤں میں بھی اچکچا ہٹی تھی۔ ایک اضطراب سا! ایک قسم کی پریشانی سی رکاوٹ سی! اس نے ایک پاؤں اٹھایا اور زمین پر دھرنہ ہی چاہتی تھی کہ اچانک مری اور پھر مہرو کے قریب آگئی۔ اس کے رخساروں پر اسی سرفی دوڑ گئی جس کا دنیا بھر کے زبان دنوں نے ابھی تک کوئی نام نہیں رکھا۔ آنکھوں پر پانی کی بلکل سی تہہ چھا گئی۔ ہونٹوں پر حسین بے بی منڈلانے لگی۔ اس نے دلبی زبان میں کہا۔ ”تمہارا نام کیا ہے۔؟“

”مہر خان۔“

”مہر خان؟“

”جی،“ ”مہر خان، تم..... تم کس وقت گھرو اپس جاؤ گے؟“

”شام سے بہت پہلے۔“

”کیوں؟“

”بہن کی دیکھ بھال کے لیے۔“

”تمہارا مکان گاؤں کی کس جانب ہے؟“

”مشرق کی طرف، نیم کے درخت والا مکان۔ ہمارے گاؤں میں اور کسی کے گھر نہیں۔“

”اچھا!“

”مگر یہ تم نے پوچھا کیوں؟“

”گناہ تو نہیں کیا۔“

”نہیں، مگر میرے گھر کا پتہ تو آج تک کسی نہیں پوچھا۔“

”غرض والے پوچھ لیتے ہیں مہر خان!“

یہ کہہ کر وہ اپنے گھر کی طرف چل دی۔ مہرودن بھر لڑکی کی باتوں کا حل تلاش کرنے کی کوشش میں مصروف رہا۔ بکریاں کہیں سے کہیں چلی گئیں۔ آخر شام سے بہت پہلے اس نے سب کو اکٹھا کیا اور وہی پرانا گیت گاتا ہوا گھر کی طرف چل دیا۔

”تیری میری یاری ندیاں چھر کے مل ماہیا۔“

ابھی مہر و مکان سے کافی دور تھا کہ اسے اپنی ماں تیزی سے اس کی طرف آتی نظر آئی۔

اس نے بہن کی یہاری کی فکر سے مضطرب ہو کر کہا۔ ”کیوں کیا بات ہے ماں؟“

”آج ایک لڑکی تمہاری بہن کو پوچھنے آئی ہے بیٹا! بڑی بھولی اور اچھی لڑکی ہے۔ اس کی ماں تو شاید تمہیں جانتی ہے۔ وہ بتی ہے مہر خان ہمیں اچھی طرح جانتا ہے!“

مہر خان نے اپنا اضطراب چھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”ماں انہوں نے میری بکریوں کو الوں سے بچایا تھا۔“

مہرودی ماں نے بکریوں کو باڑے کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔ ”اچھا اچھا! خدا ان کا بھلا کرے۔“

مہرودیزی سے مکان کے دروازے پر آیا اور اندر جھانکنے لگا۔ وہی لڑکی اس کی بہن کے پاؤں سہلارہی تھی۔

مہرودی اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”تم یہاں کیسے آئیں؟“

لڑکی نے چادر کو ماٹھے تک کھینچتے ہوئے جواب دیا۔ ”اپنی بہن کو پوچھنے۔“

مہرودی نے مریضہ کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ ”کیوں کیا حال ہے بہن؟“

”سینے میں آگ لگ رہی ہے میرے بھائی! تمہیں دیکھنے سے جی کو ٹھنڈک پہنچتی ہے۔“

مہرودی آنکھوں کے کونوں پر لرزتے ہوئے آنسوؤں کو اپنی کھرد روی گیڑی سے پوچھا اور باہر نکل گیا۔

”لڑکی جس کا نام نور تھا، روزانہ مہرودی کے گھر آتی۔ مہرودی روزانہ شام سے بہت پہلے گھر پہنچ جاتا اور مہرودی ماں روزانہ مہرودی کو نور کے ساتھ کچھ فاصلے تک بھیجنتی تاکہ وہ اندر ہیرے میں بھٹک نہ جائے۔ دو ایک دفعہ نور کی ماں بھی خاتون کو پوچھنے آئی۔ اب مہرودی اور نور کا انس ایک ایسے تعلق میں تبدیل ہو چکا تھا جس کا محبت اور عشق سے بھی کچھ اونچا درجہ ہے۔ وہ ایک دوسرے کے پیjarی بن چکے تھے۔“

دونوں کی روچیں تحلیل ہو کر ایک ہو گئی تھیں۔ انہوں نے ایک دوسری کے جذبات کو آنکھوں کے رستے جذب کر لیا تھا۔

مہرو کی بہن کی بیماری اپنی آخری حد تک پہنچ چکی تھی اور مہرو نور کے ساتھ چند فردوی لمحے گزارنے کے بعد اپنی بہن کی تباہی کو دیکھ کر روتا تھا۔ سرت اور غم کے اس امترانج سے اس کے حواس بے طرح بے ربط ہو گئے تھے۔ اسے اپنی بہن سے بھی محبت تھی۔ اپنی بہن اور پھر اکلوتی بہن سے کس بھائی کو محبت نہیں ہوتی؟ جس بھائی کی کوئی بہن نہ ہو وہ کتنا بد قسمت بھائی ہے!!

ایک دن کا ذکر ہے، مہرو اپنی بکریاں گاؤں سے چڑاگاہ کی طرف لا رہا تھا کہ اسے نور آمدی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ایک جھاڑی کی اوٹ میں لے گئی۔ آسان بالکل صاف تھا۔ چڑیاں بہر جھاڑیوں پر پھینک رہی تھیں۔ ہوا ایک مقدس اور پراسرار سربراہت سے ہرے بھرے کھیتوں پر تحریرتی جاری تھی۔ گڈنڈیاں سنہری فیتے کی طرح میدان کے چاروں طرف بل کھاری تھی۔ نور نے مہرو کے خوب صورت بالوں پر ہاتھ رکھا اور بولی۔ ”آج تم مجھے یہ بتاؤ کہ اگر مجھے آگ میں جھونک دیا جائے تو تم کیا کرو گے؟“

”میں اپنی زندگی کی پرواہ کرتے ہوئے آگ میں کوئی تمہیں باہر نکال لاؤں گا۔ یا جل مروں گا۔“

”تم نے آج تک کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ مہر خان! دیکھو مجھے آج ایک مصیبت سے بچاؤ گے؟“

”تم کہو تو سہی!“

”کل صبح میرا بابا پ مجھے ایک ایسے شخص سے بیاہ دے گا جس سے اسے بہت روپیہ ملنے کی امید ہے۔ خدا جانے وہ کون ہے؟“
”کہاں کا رہنے والا ہے اور کیسا ہے؟ میں کچھ نہیں جانتی۔ اور اگر میں اسے جانتی بھی تو کیا تمہیں چھوڑ کر جا سکتی تھی مہر خان؟“
”مہرو کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ نور کے نزدیک ہو کر بولا۔ ”مگر تم انکار کرو!“

”میرا انکار میرے بابا کے ارادے کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔“

”تو پھر!“

”پھر اس کی ایک ہی صورت ہے۔ تم آج شام کو بکریاں گھر پہنچا کر سیدھے ادھر آ جانا۔ میں اپنے مکان کے پچھواؤڑے تمہاری منتظر ہوں گی پھر ہم دونوں یہاں سے بھاگ نکلیں گے۔ کسی ایسی بستی میں جہاں ہماری محبت پر نکتہ چینی کرنے والا کوئی نہ ہو۔ جہاں ہم ان لعنتی بندشوں سے آزاد ہیں۔“

”مہرو کی آنکھیں چک اٹھیں۔“

”میں ضرور آؤں گا۔“

اور یاد رکھنا، اگر تم شام کے بعد کچھ دیر تک وہاں نہ پہنچ تو پھر۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں؟ پھر میرا باپ شام کے بعد مجھے ساتھ لے کر اپنے ہونے والے داماد کے گاؤں میں چل دے گا۔ اور میں سچ بتاؤں میں تمہارے بغیر نہ جی سکوں گی۔ صحیح کو کسی کو میں سے میری لاش ہی ملے گی۔“

”ایسا نہ کہو تو رامیں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر میں شام تک تمہارے پاس نہ پہنچ سکتا تو۔

نور نے مہرو کو روکتے ہوئے کہا۔ ”خیر، مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ میں تمہیں بہت آزمائچکی ہوں۔“

پھر وہ وہاں سے چل گئی۔ مہرو دیر تک اسے اپنی جھونپڑی کی طرف جاتے دیکھتا رہا۔ سر بر سر کھیتوں کے کنارے ایک نو خیڑوکی کو جاتے دیکھنا کیسا الطیف منظر ہوتا ہے؟

مہرو چاہتا تھا کہ اس کا بس چلتے تو وقت کو گروں سے پکڑ کر دور پھینک دے اور دو پھر کو ابھی شام کر دے۔ اس نے کچھ وقت ایڑیاں رکڑ گز کر گزارا اور شام سے بہت پہلے بکریوں کو ہانتا ہوا گاؤں کی طرف چل دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ بکریاں میرے آگے بھاگتی جائیں اور میں پل بھر میں واپس آ کر نور کے ساتھ کہیں نکل جاؤں۔

گھر پہنچ کر اس نے جلدی جلدی بکریوں کو باڑے میں بند کیا۔ مکان کے اندر جانے کی اسے کوئی ضرورت پیش نہ آئی مگر بہن۔ وہ کانپ کر لوٹا۔ جاتی دفعہ اپنی بیمار بہن کو دیکھنا میرا فرض ہے۔ اس نے آہستہ سے اندر قدم دھرا۔ اس کی ماں فرش پر نیٹھی ماتھے پر ہاتھ رکھ کر رورہی تھی۔ مہرو گھبرا سا گیا۔ ”بہن!“

اس کی بے نور آنکھیں چھپت پر گزی تھیں۔ سانس لیتے وقت گلے میں غرغراہٹ کی سی آواز پیدا ہوتی تھی۔ ابروؤں کے درمیان پینے کے چند قطرے کانپ رہے تھے۔ مہرو کا سر چکرا گیا۔ نبضیں بہت تیز چلنے لگیں۔

اس نے کاپنی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میری بہن! میری اچھی بہن!“

خاتون کی آنکھوں میں ایک خفیہ سی جنبش ہوئی اور وہ مہرو کے پینے سے شرابور چہرے پر جم گئیں۔ اس کے پھٹے ہوئے ہونٹ کچھ کہنے کو ہے مگر کوئی آواز پیدا نہ ہوئی۔ ماں نے اس کے بازو سیدھے کر دیئے اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ ایک دفعہ کانپی اور سرد ہو گئی۔ مہرو نے اس کی نبضوں پر ہاتھ رکھا اور تیورا کر گر پڑا۔

ہوش آیا تو اس کی بہن کے اردو گاؤں کی بہت سی عورتیں بیٹھی رورہی تھیں۔ اس کی ماں جھک کر اس کے ماتھے پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

”میرے بچے! اب طبیعت کیسی ہے؟“

مہر و گھبرا کر چار پائی سے انہوں بیٹھا۔ ”کیوں؟ مجھے کیا ہو گیا ہے ماں؟ کیا وقت ہو گیا ہے ماں؟“
”لوگ سو گئے ہوں گے بیٹا!“

”لوگ سو گئے ہوں گے؟ تم نے مجھے جگایا تک نہیں!“

مہر و چار پائی سے کو دکر فرش پر آ رہا۔ برہنسہ سر برہنسہ پا بھاگ کر دروازے تک گیا۔ ایک بار پلت کر اپنی مردہ بہن کے حضرت زدہ زرد چہرے کو دیکھا پھر اپنی چینی ہوئی بوڑھی حیران ماں کو! پکھڑ کا بڑھا مٹھکا اور آنسوؤں کو پینے کی بے سود کوشش کرتے ہوئے اس نے تیزی سے کواڑ بند کر دیئے اور گاؤں سے بھاگ نکلا۔ ماں کی دروناک چینیں دور تک اس کا تعاقب کرتی رہیں۔ وہ ہوا کی طرح اڑا جا رہا تھا۔ دو تین جگہ لھاس میں اس کے پاؤں انجھے اور وہ بربی طرح گرا مگر اسے کوئی چیز نہ روک سکی۔ ماں کی وہ آواز بھی نہ روک سکی جس کے سامنے وہ کائنات کوٹھکر ادینے پر تھار رہتا تھا۔ وہ اندھیرے کو چیرتا جھاڑیوں کو پھاندتا اور کنکریوں کو روشن تابھا گا جا رہا تھا۔ نور کے مکان کے قریب پہنچا تو اس کا کلیجہ منہ کا آر رہا تھا۔

اس نے نور کی ماں سے نذر ہو کر دروازے پر زور زور سے چیننا شروع کیا۔

”نور! نور!! نور!!“

اس نے اپنی بھوکی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھائیں۔ ستارے مسکرا کر اس کا مٹھکہ اڑا رہے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھ زور سے ماتھے پر مارے اور دھرام سے زمین پر گر پڑا۔
وہ جا چکی تھی۔



انتقام

سیاہ چناؤں سے گھری ہوئی نیلی جھیل کی سوئی ہوئی سطح پر مرغاییوں کے غول کے غول کے غول پھیلے جا رہے تھے۔ مشرق پہاڑیوں کی چوٹیوں کے قریب سے سورج کی پتی زرد کرنیں تکل کر فضا میں تیرتی ہوئی چند آوارہ بدیوں کو سنہری جائے پہناری ٹھیس اور لہراتی ہوئی بھوری گلڈنڈی پر اکبر اپنی نیلی گھوڑی پر سوار زیر لب گنگنا تا ہوا اڑا جا رہا تھا۔ گول گول سنگریزے گھوڑی کے سموں سے مکرا مکرا کر اور نیچے گھاٹیوں میں لڑک لڑک کر ایک عجیب نغمہ الاپ رہے تھے۔

اکبر گاؤں کے ایک بڑے ریس کا اکلوتا پیٹا تھا۔ وہ جماعتیں پاس کروائے باپ نے اسے اپنی زمینوں کی دیکھے بحال پر مقرر کر دیا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ بی اے ایم اے کی آج کل کوئی قیمت نہیں اور اس کا بھیجا ایم اے ایل ایل۔ بی ہو کر اپنے ضلعے کے صدر مقام میں بیٹھا جو کچھ کمارہ تھا اس سے بھی وہ بے خبر نہیں تھا۔ اکبر نہایت ذکری اور بامداق نوجوان تھا۔ گاؤں کے بڑے بوڑھوں کی مجلس میں بیٹھ کر جب وہ باتیں کرنے لگتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ تجربے کے لحاظ سے وہ ان بھوری ڈاڑھیوں اور جھکی کمروں والے بزرگوں سے کچھ کم نہیں اور جب گاؤں کے نئے نئے بچے اسے گلی میں گھیر لیتے اور ”پیے کی رویوڑیاں لے دو“ پیے کی رویوڑیاں لے دو بھیا، کی رست لگا دیتے تو وہ انہیں خوش کرنے کے لیے ایسی عجیب عجیب حرکتیں کرتا کہ بھیارن کے تنوں میں روٹیاں پکوانے والی لڑکیاں ہستے ہستے زمین پر لوٹ جاتیں اور خود بھیارن کے کھانی میں لپٹے ہوئے تھیوں سے تمام محلہ گونج احتا!

آج وہ تحصیلدار صاحب کو ملنے جا رہا تھا جو اس کی تحصیل میں نئے نئے تشریف لائے تھے اور جن کے متعلق مشہور تھا کہ وہ آدمی تھنواہ غریبوں، لنگزوں، اندھوں اور محتاجوں کو دان کر دیتے ہیں اور باقی نصف سے اپنا بہت بڑے کنبے کا پیٹ پالتے ہیں۔ لوگ پہلے تحصیل دار صاحب سے بے حد بیک آچکے تھے کیونکہ تین سال ان کی تحصیل میں رہ کر انہوں نے علاقے کے مرغوں کی نسل تباہ کر دی تھی اور میرا سیوں دھویوں سے چونی اٹھنی لے کر ان کے سامنے گاؤں کے سردار کو گھر کر دیتے تھے۔

جھیل کے پاس پہنچ کر اکبر نے گھوڑی کی لگام کھینچی اور اس کی گردن پر تھکی دے کر مرغاییوں کے بے شمار قافلے دیکھنے لگا۔ اچانک ایک طرف سے فائز کی آواز آئی۔ اکبر کی گھوڑی بھڑک کر اچھلی چنان پر سے سم پھسل گئے اور گھنٹوں کے بل گرگئی۔ مرغاییاں جیخنی پھر پھر اتی سرمی فضاوں میں بکھر گئیں۔ دور جھیل کے وسط میں دوزخی مرغاییاں اپنے پر پھر پھر اتی اور اپنے پنجوں سے پانی کی

سطح پر باریک سیدھی لکیریں کھینچتی اور اٹھنے کی کوشش کرتی تھیں۔ ادھر سے دُخُل بھی جھیل میں کوڈ پڑے اور بڑی پھرتی سے تیرنے لگے۔ آن کی آن میں انہوں نے مرغابیوں کو جالیا اور وہیں پانی میں اللہ اکبر پڑھ کر چھپری پھیر دی۔ پھر انہیں اٹھا کر تیرتے ہوئے اکبر کی طرف آنے لگے۔

اکبر ایک تو اپنی خوب صورت گھوڑی کے خون آلو دکھنے دیکھ کر غصے سے لال ہو رہا تھا، دوسرے انہیں قریب سے دیکھ کر اسے معلوم ہوا کہ وہ دونوں شکاری فتو اور سرخواں کے خاندان کے جدی دشمن ہیں جن کی اکبر اور اسے کے والد سے آئے دن ذرا ذرا سی باتوں پر جھپڑ رہتی ہے۔ اکبر غصے سے بل کھانے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ دونوں اسے ضرور چھیڑیں گے اور اس سنان جگہ پر اسے اکیلا دیکھ کر اس کی بے عزتی کرنے کی کوشش کریں گے مگر وہ اکبر کو پیچاں کر قدرے ٹھکے اور اپنی رفتار میں نمایاں کی کر لی۔ اکبر کچھ دیر وہاں ٹھہر ارہا اور جب وہ ٹھکلی پر آ کر ایک طرف جانے لگے تو اس نے بھی گھوڑی کو ایڑ لگا دی۔

وہ ابھی دو فرلانگ دور گیا ہو گا کہ پیچھے سے اسے ایک عجیب قسم کی کھانی کی آواز آئی اور اس کے بعد اس مخصوص کھانی کا طوفان جاری ہو گیا۔ اس نے پلت کر دیکھا تو شکاری ایک چٹان پر کھڑے اسی مسحکہ خیز کھانی میں مصروف تھے۔ اور پاگلوں کی طرح ہنسنے جا رہے تھے۔ اکبر کے غرہ نفس کو ٹھیس سی لگی۔ شکاری اکبر کو پلتتا دیکھ کر آگے چل دیئے اور اکبر نے محسوس کیا کہ اگر اس نے ان سے اس بے معنی کھانی اور بے محل ہنسنے کی وجہ نہ پوچھی تو گاؤں میں جا کر وہ اس معمولی سی بات کو ایسا نون مرچ لگائیں گے کہ ہر شخص یہ یقین کر لے گا۔ کہ اکبر ظاہری طور پر تو مونچھوں کوتا و دیئے پھرتا ہے مگر اندر سے کھوکھلا ہی ہے۔ لاڈلی عورت کی طرح بزدل!

اس نے اپنی گھوڑی موڑ کر اس کی با گیس ڈھیلی کر دیں اور آن واحد میں دشمنوں کے پاس پہنچ گیا۔ وہ بھی گذشتی کے سچ میں اکڑ کر کھڑے ہو گئے۔ اکرنے جاتے ہی پوری سختی سے پوچھا۔ ”تمہارا اس بے معنی کھانی اور ان لمبے قہقہوں سے کیا مطلب تھا؟“ ان میں سے ایک نے ماتھے پر ٹکنیں ڈال کر اور مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”تو کیا ملک جی کے علاقے میں کھاننا اور ہنسنا بھی منع ہے؟“

اکبر کا ماتھا ٹکنے کا دشمن کی زبان سے ایسے طنزیہ الفاظ ان کر اس کا خون کھول اٹھا۔ وہ انہیں ڈپٹ کر بولا۔ ”ہاں میرے علاقے میں یہ بیہودہ کھانی اور یہ فضول قہقہے منع ہیں اور میں ان بدمعاشوں کی گرد نہیں تاپنے میں بھی طاقت ہوں جو اپنے آقا کو آنکھیں دکھانے میں نہیں چھکتے!“

”آج کل ہر شخص اپنا آقا آپ ہے ملک جی! آج کل کوئی کسی کا غلام نہیں۔“ ایک شکاری بولا۔ ”زمانہ بدل چکا ہے اور ایڑیاں

چانے والے کتے، کلیج نو پختے والے چیتوں میں تبدیل ہو چکے ہیں!

اکبر بے تحاشا گھوڑی پر سے کو دکھنے آ رہا اور بیدھاتے ہوئے بولا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا؟ رتی بھر لوگوں کو من من بھرا تھیں زیب نہیں دیتیں۔ ہمارا پس خور وہ کھانے والے ذمیل لوگوں کو اتنے بڑے بول نہیں بولنے چاہیں۔ سمجھے؟“
”بکواس نہ کرو۔“ دوسرا شکاری آگ بگولا ہو کر بولا۔

مغلظ گالیوں اور بلند چینوں کا طوفان اٹھا اور سورج کی کرنوں میں دکتی ہوئی چنانیں جیرانی نظر آنے لگیں۔ اکبر دونوں دشمنوں پر پل پڑا۔ ایک کا چاقو چھین کر ان پر وار پر وار کئے۔ پہلو بدل بدل کر ان پر شیر کی طرح جھپٹتا رہا۔ زخم لیتا رہا اور دیتا رہا مگر اچانک کھو پڑی پر بندوق کا پھل پڑنے سے اس کا دماغی توازن قائم نہ رہ سکا اور وہ لڑکھڑا کر نکل رہا پر گر پڑا۔ گھوڑی اس زور سے ہنہنائی کر دو دو میل دور کے جھونپڑوں میں سوئے ہوئے کتے بھی بے اختیار چونک کو بھونک اٹھے۔ دونوں شکاری پکڑنڈی چھوڑ کر گہری گھاٹیوں میں بھاگنے لگے اور اکبر کے سر سے خون کی ایک باریک دھار نکل نکل کر اس کی گھوڑی کے سموں پر پڑنے لگی!

بہت دیر کے بعد اسے ہوش آیا۔ سورج افق پر ایک نیزہ بلند ہو چکا تھا اور آس پاس کی پہاڑیوں پر بھیڑ بکریاں چڑھی تھیں۔ اکبر کے سر میں بے اندازہ درد تھا۔ کاندھے اور چھاتی کے زخم اکڑ گئے تھے۔ گھوڑی کا جسم پینے سے شراب اور ہور ہاتھا۔ وہ بے مشکل اٹھا۔ منہ پوچھ کر چادر سر پر لپیٹ لی اور گھوڑی پر سوار ہو کر اپنے گاؤں واپس آگیا۔

اس کا بوزھا باپ اسے اس بیت کذائی میں دیکھ کر لرز اٹھا۔ سفید بھنوں میں چھوٹی چھوٹی دھنڈی آنکھوں پر جھک آئیں۔ ”اکبر بیٹا! کیا ہوا ہے تمہارے دشمنوں کو؟“ اس نے کھاث پر سے اترنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

اکبر نے اسے سارا قصہ کہہ سایا اور باپ سے اجازت چاہی کر اپنے تمام مزاریں کو اٹھا کر کے فتو اور سرخو کے گھروں میں آگ لگادیں، ان کے پچھوں کو ذبح کر دے، ان کی عورتوں کو گلیوں میں نیچا کھینچتا پھرے۔ خود ان دونوں کو گلیے تکوں میں باندھ کر پھینک دے اور تکلوں کو دیا اسلامی دکھادے۔

بوزھار بیس مسکرا یا اور زخمی بیٹے کی پیٹھ پر شفتت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ”بیٹا مانا کہ تم یہ سب کچھ کر سکتے ہو مگر وقت اور تحریکے نے مجھے بڑے بڑے سبق سکھائے ہیں۔ معلوم ہے ان باتوں کا انجام کیا ہو گا؟ تم گبرو ہو، تمہارا خون کھول رہا ہے، تم اپنے دشمنوں کی کچھی بوشیاں تک چبانے پر تکے ہوئے ہو میں نے بھی یہ وقت کا تھا ہے بیٹا! اور اک بار تو میں نے اپنے ایک دشمن کو ایک گلی میں زبردستی گردایا اور اس کی ناف پر دکھتا ہوا انگارہ رکھوادیا۔ لیکن جب تھانے میں طلبی ہوئی، تحصیل میں اپنے شرکوں کے سامنے مجرم

کی حیثیت سے پیش ہوا جرمانہ ادا کرنا پڑا تو وہ لوگ بھی مجھے آنکھیں دکھانے لگے جن کا کام آٹھ پہر میری خوشامد کرنے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ سوان باتوں میں کچھ نہیں دھرا بیٹا! تم دیکھو گے کہ ایک وقت آئے گا جب تمہارے دشمن تمہارے محتاج ہوں گے اور اس وقت تم ان پر وار کرنے میں حق بجانب ہو گے۔ خاموش ہو رہو۔ تمہارا غصہ مختندا کرنے کے لیے قدرت خود ہی کوئی سیل پیدا کر دے گی!"

اکبر خاموش ہو رہا مگر بے حد بے دلی سے! اس نے اپنے شانوں کو اس بے قراری سے جنبش دی کہ اس کی چھاتی کے زخموں سے نئے سرے سے خون رنسنے لگا۔ ایک دوبار اس کا جی تو چاہا کہ باپ سے چھپ کر دو چار دوستوں کو ساتھ لے کر دونوں بدمعاشوں کی کھوپڑیاں توڑ کر ان کا گودا نگل جائے اور پھر اس کی ماں نے بھی اس کے اس خیال کی تائید کی اور کہا۔ "واری جاؤں میرے لال! تجھے ایک بار بچپنے میں کائنما چھا تھا اور مجھے رات بھر نیند نہ آئی تھی۔ اب جوتی ری چھاتی اور سر سے سیروں لہو نگل چکا ہے تو میں کیسے کھاؤں پیوں؟ میں کیسے جیوں؟ تیرے ابا کا دل تو برف کا ٹکڑا بن کر رہ گیا ہے۔ انہیں تو نہ اپنی آن کی پرواہ نہ اپنی شان کی فگر۔ جا کر دس بارہ میرا سیوں دھو بیوں کو ذرا سا اشارہ کر دے۔ ان خدائی خواروں کے پاتھ کاٹ کر لے آئیں کہ میں انہیں پاؤں تلتے رو نہ کر اپنا کلیج ٹھنڈا کروں!"

لیکن اکبر نے کئی بار اپنے باپ کی نصیحتوں پر چل کر اچھے چھل پائے تھے۔ اب کے گواہے باپ کی نصیحت میں حکمت نظر نہ آتی تھی لیکن اس کا بغاوت کا جذبہ باپ کی فرمانبرداری کے جذبے سے کچھ نیچے درجے پر ہی تھا اور اس نے اپناروحاںی اضطراب کم کرنے کی کوئی کوشش نہ کی۔

گلیوں میں اور چوپالوں پر اکبر کے زخمی ہونے کے قصے سنائے جانے لگے۔ اکبر کے گھر لاٹھی بیکتی ہوئی بوڑھیوں اور نسوار سو گھنٹے ہوئے بوڑھوں کا تانتا لگ گیا۔ انہیوں نے فتو اور سرخو کو ہزار ہزار گا لیاں دیں۔ اکبر کے دوستوں نے باری باری آ کر اپنے آپ کو جان پر کھیل جانے کو پیش کیا لیکن اکبر نے انہیں سمجھایا کہ ہمیں کسی خاص موقع کا انتظار کرنا چاہیے۔ انتقام لینے میں اس طرح لطف آئے گا۔ نئے نئے بچے بھی اس دن اسے پوچھنے آئے۔ گوز باتوں کو جنبش نہ دے سکے مگر ان کی آنکھیں زبان حال سے کہہ رہی تھیں کہ درد کی شدت میں ہماری ریوڑیوں کو نہ بھول جانا۔ اکبر ان کی تیزی سے جھکتی ہوئی پکلوں اور لرزتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھ کر مسکرایا اور انہیں ایک دو فی دی۔ دوسرے دن اسے یہ سن کر بہت ہنسی آئی کہ گاؤں کے بچوں نے فتو اور سرخو کی چار بکریوں کی کمریں پتھروں سے توڑ دی ہیں۔

چار پانچ صینے گزر گئے بات شنڈی پڑ گئی۔ اکبر دو تین بار تحصیل دار صاحب سے ملاقات بھی کر آیا۔ تھا نے دار صاحب سے بھی مل آیا۔ چوپال پر بھی باقاعدہ جاتا رہا۔ بچوں کو بھی بلا ناغر بیوی یاں کھلاتا رہا لیکن اس کی چال ڈھال وضع قطع سے اضلال سانپکتا تھا، وہ مغموم سارہتا تھا اور کئی بار بیٹھے بیٹھے اس نے ایک چیز کو دیکھا اور پھر بہت دیر تک اس پر سے نگاہیں نہ ہٹائیں۔ لوگ تو آپس میں چہ میگویاں کرتے۔ ”یہ نوجوان اپنے دشمنوں پر بجلی بن کر گرے گا۔ دیکھتے نہیں اس کی حالت؟ یقیناً ان دونوں بدمعاشوں کی موت قریب ہے!“

ایک رات کا ذکر ہے سردیوں کا موسم تھا اور سردیوں میں چوپال کی محفلیں بہت طویل ہو آتی ہیں۔ کچھ کھلے مکان کے وسط میں الاؤ کے ارد گرد گاؤں کے بچے بوڑھے اور جوان بیٹھے ہاتھ پر سینک رہے تھے۔ حقے کا دور چل رہا تھا اور اکبر ان سب کو دوست دینے کے طریقوں سے آگاہ کر رہا تھا۔ ”تم دراصل جانتے نہیں کہ تمہاری ہاں اور نہیں سے کہی بڑے بڑے پیٹ والوں کی قسمیں وابستہ ہیں۔ دیکھو اگر تم دوست نہ دیتے تو سردار اللہ رکھا اس طرح فوں فاں کرتا ہوا موسروں میں نہ اڑا پھرتا۔ دیکھی تھی اس کی حالت؟ تمہارے در پر تمہارے بزرگ اور بیرونیے کر آیا۔ دوست مجھے دینا، دوست مجھے دینا۔ میں تمہارے لیے یہ کروں گا وہ کروں گا۔ زمین آسمان کے قلا بے ملا دیئے تھے اس نے اور اب کل ہی کی بات ہے میں نے اسے کہا۔“ ذرا ہمارے گاؤں کی سڑک تو ٹھیک کر دیجئے۔ آمدورفت زیادہ ہے، قدم قدم پر گڑھے ہیں۔“ کہنے لگا۔ ”میں نے کوشش تو کی تھی مگر سر کارنے نہ مانا۔“ اب اس سے کوئی پوچھنے کہ آخر تم کس مرض کی دوا ہو۔ اگر اب بھی تم پر سرکار کا بھوت سوار ہے تو ”ہماری حکومت ہماری حکومت“ کی رث کیا لگا رکھی ہے۔ صاف کہہ دو کہ ہم تو کھلو نے ہیں جن سے سرکار کھیل رہی ہے اور دوسروں کا دل بیکل رہا ہے۔“

ایک بوڑھا حصہ اٹھا کر اکبر کے آگے دھرتا ہوا بولا۔ ”لے ملک کش لگا لے اور مجھے یہ بتا کہ تو جو اللہ رکھا کے خلاف اتنی لمبی لمبی باتیں کر رہا ہے تو اپنی حالت کیوں بھول گیا؟ دو کم بخنوں نے تجھے دیرانے میں زخمی کر دیا اور توتب سے اس طرح خاموش ہے جیسے وہ سب کچھ مذاق تھا۔ ہم تیرے غلام ہیں بیٹے! تو مجھے بوڑھے کو اشارہ کرتا تو میں اپنے ان کمزور ہاتھوں سے ان کے طلق دبادیتا۔ تیرے باپ دادا نے تو ذرا ذرا سی باتوں پر کئی لوگوں کی پسلیاں برچھیوں سے کاٹ کر رکھ دی تھیں اور تو ہے کہ کبھی گاندھی کی باتیں کرتا ہے کبھی سکندر حیات کے تھے۔ تو اپنا علاج کر۔ تجھے معلوم نہیں کہ تیرے اس رویے سے تیرے خاندان کے ماتھے..... پر بوڑھے کو کھانسی شروع ہو گئی اور تمام چوپال والے حیرت سے اکبر کا منہ تکنے لگے جو فرش سے ایک تنکا اٹھا کر خاموشی سے اسے توڑنے میں مصروف تھا۔

اچانک گاؤں میں ایک شوراٹھا۔ تیز و تند چیخ پکار میں ”چور۔ ڈاکو بھاگ گئے، ادھر نکل گئے“ کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ چوپال والے ہاتھوں میں لاثھیاں سن جاتے ہوئے بھاگے۔ ایک ماشر جی جو ہفت بھر سے پراہنی سکول کے اول مدرس مقروہ ہو کر آئے تھے گلی میں کھڑے چیخ رے تھے۔ ”ارے میں لٹ گیا، میں تباہ ہو گیا، پر دلیسی کی مدد کرو۔ ڈاکو میرے گھر کا تناک تناک اٹھا کر لے گے ہیں۔ میری عمر بھر کی کمائی جسم ہو گئی!“ تمام گاؤں جاگ اٹھا۔ نوجوانوں نے گاؤں کے ارد گردناکہ بندی کر دی کر دی چور کہیں نہ مل سکے۔ پر دلیسی ماشر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”ہوسکتا ہے کہنا کہ بندی کرنے والے نوجوانوں ہی میں چور چھپے ہوئے ہوں۔ مجھ پر دلیسی کے معاملہ میں گھری تحقیق کرنے والا کوئی نہیں!“

اکبر نے اپنے چوکیدار کو تھانے کی طرف بھیج دیا اور صبح پوچھئے سے پہلے ہی تھانیدار صاحب پانچ سا ہیوں سمیت موقعہ دیکھنے تشریف لے آئے۔ چوروں کے قدموں کے نشان مکان کی دیواروں کے ساتھ ساتھ بہت دور تک چلے گئے تھے۔ کھوجیوں کو طلب کیا گیا۔ انہیں رخصت کرنے سے پہلے اکبر کے بوڑھے باپ نے انہیں اپنے ہاں بلوایا اور ان کے کان میں اہستہ سے کہا۔ ”تم جانتے ہو میں نے تمہیں کیوں یاد کیا؟ تم میری غیرت و غصہ سے تو خوب واقف ہو مگر اکبر کے معاملے میں میں خاموش رہا کہ کہیں اسے کوئی تقصیان نہ پہنچے ورنہ ان بدمعاشوں کو میں آن واحد میں چلکی میں مسل دیتا۔ میں تو ڈرتا تھا کہ اگر میں نے اکبر کو انتقام کی اجازت دے دی اور وہ کوئی اوچھا وار کر بیٹھا تو قانون کب کسی کا ساتھ دیتا ہے؟ اب خدا نے یہ موقع پیدا کیا ہے۔ تو کھونج کے لیے بلائے جا رہے ہو اور یہ تمہارے بس میں ہے کہ تم پاؤں کے نشانات فتو اور سرخو کے گھر لے جاؤ۔ کسی کو شک بھی نہ پڑے گا اور میری روح کو بھی تسلیم پہنچ جائے گی!“

بوڑھے کھوجی اپنے بوڑھے آقا کے حکم پر سالم ہم کرتے ہوئے اٹھے اور سینکڑوں کے مجمع میں نہایت ہوشیاری سے پاؤں کے نشانات فتو اور سرخو کے گھر تک لے گئے۔ وہ دونوں بھی تماشا یوں میں شامل تھے۔ ان کے منہ کھل کر کھل رہے گئے۔ تھانیدار نے ان کی طرف دیکھا تو انہیں اس قدر پسند چھوٹا جیسے ابھی تالاب سے نہا کر نکلے ہیں!

مجموع چوپال پر آ گیا۔ سب لوگ خوش تھے کہ گاؤں کے رئیس کے دھمن ان کے سامنے مجرموں کی حیثیت سے کھڑے ہیں۔

تھانیدار صاحب نے تمام مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”بھائیو کھوجیوں کی تفتیش کے مطابق ماشر جی کے گھر میں ان بدمعاشوں نے نق卜 لگائی ہے۔ تم میں وہ کون ہے جو ان کی نیک چلنی کا ثبوت دے سکے؟“

تمام مجمع خاموش تھا۔ تھانیدار صاحب نے اکبر کی طرف دیکھا جو سر جھکائے اپنی چہری سے زمین پر بے ڈھنگی ای لکیریں کھینچ رہا

تحانیدار صاحب بولے۔ ”کیوں ملک اکبر! اب تمام فیصلہ تم پر موقوف ہے۔ تمہاری گواہی ان بدمعاشوں کی قسمت کا فیصلہ کر دے گی۔ تمہارا ان کے چال چلن کے متعلق کیا خیال ہے؟“

فتاویٰ اور سرخور سے پاؤں تک کا نپ گئے۔ ان کا بچا کھچا خون بھی خشک ہو گیا۔ تمام لوگوں کی نگاہیں اکبر پر جم گئیں۔ اکبر کا باپ بھی ایک طرف ایک پنگ پر بیٹھا زیر لب مسکرا رہا تھا۔

اکبر نے سر اٹھایا اور دونوں دشمنوں کو دیکھا۔ طرفین کے دماغوں میں ایک بار پھر جھیل کے کنارے سیاہ چٹانوں کے درمیان چھروں اور گھونسوں کے طوفان کا نقش پھر گیا۔ اکبر کے ہوت خشک ہو رہے تھے۔ رنگ فق تھا۔ سارا مجھ کمال تعجب اور انتظار سے اس کے لبوں کی ذرا سی حرکت کا منتظر تھا!

آخروہ بولا۔ ”جہاں تک میرا ذاتی تحریب ہے، میں نے ان دونوں کے خلاف کبھی کوئی شکایت نہیں سنی!“

”کیا؟“ بوڑھا بزرگ پنگ پر اچھل پڑا اور سارا مجھ یوں کا نپ گیا جیسے ان کے جسموں میں بجلی کی لہریں طول کر رہی ہیں۔ فتو اور سرخواں نکھیں جھپکنا بھول گئے!

اکبر پھر بولا۔ ”میں نے انہیں ہمیشہ شریف اور خلیق پایا۔ ان پر چوری کا نکل کرنا ظلم ہے!“

سینکڑوں نظریں اکبر پر پڑیں اور تادیر و ہیں جھی رہیں۔ تھانے دار صاحب نے فتو اور سرخو کو آزاد کر دیا اور معاملے کی تفتیش نے سرے سے شروع کر دی!

اسی رات چاند کی وہندي روشنی میں گاؤں سے باہر ایک گھنڈر کے قریب دو سائے منڈلا رہے تھے۔ ایک سایہ بہت باریک آواز میں دوسرے سائے سے بولا۔ ”پیارے اکبر! تم نے اتنی بڑی قربانی دی ہے کہ شاید ہی اس علاقے میں کبھی کسی نے دی ہو۔ تم نے میرے بھائیوں کی جان بچا کر اپنے اس پیار کا ثبوت دیا ہے جس کا کوئی اور چھور نہیں۔ آج کے بعد بھی اگر میں تمہارے پیار کا جواب خاموشی سے دوں تو مجھ جیسی کمیں لڑکی شاید ہی اس دنیا میں کوئی ہو!“

دور جھیل میں چاند کا عکس پڑ رہا تھا۔ گاؤں سے ایک گھوڑی کے ہنہنا نے کی آواز آ رہی تھی۔



غور نفس

عرضہ ہوا ایک پہاڑی گاؤں میں ایک عمر سیدہ عورت نے مجھے اپنی یہ آپ بیتی سنائی تھی جسے سن کر میں نے زندگی میں پہلی بار محسوس کیا تھا کہ محبت جاہل انسان کو بھی کس خوبی سے اپنے احساسات کا تجربہ کرنا سکھا دیتی ہے۔

”غور نفس“ مجھے اس نووار دنو جوان سے تعلقات پیدا کرنے سے روکتا تھا ورنہ جس دن سے میں نے اسے دکان سے سودا خریدتے دیکھا تھا، میرے کلیج میں چبھن سی پیدا ہوئی تھی۔ اپنے مکان کی چھت پر چڑھ کر میں گلی میں سے گزرتے ہوئے لوگوں کو چھپ چھپ کر گھورتی رہتی اور جب وہ نو جوان آنکھیں جھکائے ہوئے گلی کے کنارے پر چلتا ہوا دکھائی دیتا تو میری آنکھیں بند ہو جاتیں۔ میں چاہتی تھی کہ دیکھوں مگر پوئے من من بھر کے ہو جاتے تھے۔ میرا دل اچھل اچھل کر میری رگوں میں خون کی جگد آگ دوڑا دیتا تھا۔ میں حیران ہوتی تھی کہ جس شخص کو دیکھنے کے لیے میں اس تینی دوپہر میں چھت پر لیٹی رہتی ہوں؟ اسے اپنے سامنے پا کر میں دیکھ کیوں نہیں سکتی؟ میں یہ بھی تو معلوم نہیں کر سکتی تھی کہ اس نے میری طرف دیکھا ہے یا نہیں۔

”میں نے عمر کے سولہ سترہ برسوں میں اپنی بہت سی سہیلیاں صرف اس لیے گنوادیں کہ ان کے معمولی سے مذاق نے میرے غور نفس کو خیس پہنچائی تھی۔ ایک دن میری سب سے پیاری سہیلی نے مجھ سے کہا۔ ”جانوں تمہاری ٹاک ہے یا پودے میں لگکی ہوئی سرخ مرچ!“ مجھے جیسے آگ لگ گئی۔ اتنا خیال بھی نہ آیا کہ یہ میری وہی کیلی ہے جس نے صرف میری خاطر شہر بھر کے طعن برداشت کیے تھے حالانکہ میرے والد اور اسکے والد میں پرانی دشمنی تھی لیکن میں انہوں کی طرح اس پر برس پڑی اور کہا کہ تم میرے گھر آئی ہی کیوں؟ وہ تو چلی گئی مگر بعد میں مجھے احساس ہوا کہ میں ایک بہت بڑی فلکٹی کی مرٹکب ہوئی ہوں لیکن غور نفس کا احساس میرے پہلے احساس پر غالب آ جاتا تھا اور..... اور اب یہ نووار دنو جوان جسے گاؤں کے دو چار شخص ہی جانتے ہوں گے، جس نے مجھے صرف ایک بار دکان پر سودا خریدتے وقت دیکھا تھا! اس کے پاؤں پڑوں؟..... یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا اور اسی وجہ سے میں پریشان رہا کرتی تھی!

”والدین کسی گاؤں میں تعزیت کے لیے گئے ہوئے تھے۔ میرا نخا بھائی اپنے چچا کے ساتھ صبح کھیتوں پر چلا جایا کرتا تھا۔ گھر میں صرف ایک گائے تھی۔ دو دھن دوہ کر میرا سب سے پہلا کام یہ ہوتا تھا کہ چھت پر چڑھ جاؤں۔ اور ہر یہ خیال کہ کہیں کوئی مجھے

چھت پر چوروں کی طرح لیٹا دیکھنے لے۔ ادھر یہ خلش کہ نووار نوجوان چکپے سے گزرنے جائے۔ اندھیری راتوں میں اس کا دراز پیکر میرے مکان کے تنگ دروازے پر لہراتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ نیم کی گنجانہ بھینوں میں اس کا شرمایا ہوا چہرہ ایک پاکیزہ مسکراہٹ سے کاپنٹا اور میری جانب بڑھتا۔ پھر اچانک خاموش معموم فضا میں حلول کر جاتا۔ میں بے تاب ہو کر انھیں بیٹھتی تھی۔ صحن میں چلتی تھی، دوڑتی تھی، آنکھیں بند کر کے ایک جگہ بیٹھ جاتی تھی مگر تصورات کی پر چھائیاں اگر اپنے بس میں ہوں تو انسان کی مصیبتوں کا خاتمه نہ ہو جائے۔

میں ایک روز چھت پر چڑھ رہی تھی کہ بہت سے لوگ جن میں نوجوان لاڑکیاں بھی تھیں ایک طرف تیزی سے جاتے ہوئے نظر آئے۔ میں بھی دوڑی جا کر دیکھا تو وہی نوجوان کمہاروں کے گھر میں ایک چار پائی پر دراز ہے۔ آنکھیں بند ہیں دانت مضبوطی سے جکڑے ہوئے چہرے پر زردی اور نیلا ہٹ کا دردناک امترانج، پسینے میں شرابور۔ یا اللہ یہ کیا سحر ہے؟ میرا دل بے طرح دھون کئے لگا۔ لاڑکیاں تو اپنی انگلیاں ہونٹوں پر رکھ کر دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئیں اور مرداس کے ہاتھ پاؤں زور زور سے ملنے لگے۔ کسی نے اس کے جبڑوں کو علیحدہ کرنا چاہا، کوئی بھاگ کر دکان سے کھانڈ لے آیا مگر اب منہ کھلتا تو کھانڈ اندر جاتی۔ آخر ایک "سیانا" بلا یا گیا۔ اس نے آکر اس کے دانتوں کو چھری سے کھولا، پھر کوئی عرق ڈالا۔ ہم لاڑکیاں اب یہوں نوجوان کے قریب آگئی تھیں۔ اس نے پہلے تو ایک آہ بھری، پھر آنکھیں کھولیں اف کتنی گھری گھری سوچتی سوچتی آنکھیں تھیں اس کی! ہونٹوں پر زبان پھیری ادھر ادھر دیکھا اور انھیں بیٹھا۔

حکیم صاب نے پوچھا۔ "ملک صاحب آپ کو کیا ہو گیا تھا؟"

نوجوان کے چہرے پر خون دوڑ گیا اور اس کے رخساروں پر ایسی رونق آگئی جیسے اسے تو کچھ ہوا ہی نہیں۔ کہنے لگا۔ "حکیم جی! یہ بیماری مجھے میں آ کر شروع ہوئی ہے۔ پرسوں بھی اس طرح میں راستہ چلتے چلتے گر گیا تھا۔ میرا خیال ہے یہ بیماری میرے جان لے کر رہے گی۔ اسی بیماری پہلے نہ دیکھی تھی نہ سن تھی۔ چودھویں صدی میں خدا نے بیماریاں بھی عجیب عجیب پیدا کر دی ہیں!"

سب لوگ معموم چہرے لیے نوجوان کی صاف اور بیماری آوازن رہے تھے۔ اس نے بات ختم کر کے مجھ پر نگاہ ڈالی اور جب اس نے ہم لاڑکیوں کی طرف دیکھا تو میں نے محضوں کیا کہ اس نے مجھے کسی قدر غور سے دیکھا ہے۔ وہ کچھ مسکرا یا اور آنکھیں جھکا کر سمجھیوں سے پھر ایک بار دیکھا۔ میں نے دل میں کہا یہ صرف وہ ہے۔ وہ انھا لوگ اس کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔ ہم لاڑکیاں ایک طرف چل دیں ہمارے قریب سے دو شخص باہمیں کرتے ہوئے گز رے۔

”بھائی، غریبوں کی آہیں خطا نہیں جاتیں۔ کبھی تم نے سنا ہے کہ خال مظلوم کر کے خدا کے قبر سے بچ گیا ہو؟“

”یہ جنگلات کے سپاہی غریبوں کی کھال ادھیر کراپنا اگر بھرتے ہیں۔ فصل انھاؤ تو پہلے انہیں دُؤشادیاں کرو تو پہلے انہیں پوچھو اور جنگل سے کوئی سوکھی نہیں لانی ہوتا ان کے پاؤں چانو۔ یہ تو بے ہوش ہوا تھا، کم بخت مر جاتا تو اچھا تھا!“
”مرتا تو کوئی اور آنکھا۔“ ایک بوڑھا کھنکارتا ہوا بولا اور گلی میں دم لینے کے لیے بیٹھ گیا۔

”میں نے سوچا، آنکھیں زمین پر گاڑ کر چلنے والا شرمیلا نوجوان اور اس قدر ظالم! یہ ضرور ان کی کوئی ذاتی عداوت ہے۔ یقیناً یہ دونوں غلیظ مسوئے کرتاں والے دھقان جھوٹ بولتے ہیں جاہل بد طیت ا لوگ!“

”میں گھر آئی۔ دوسرے دن والدین بھی واپس آگئے۔ میرے دل کی جلن روز بروز بڑھتی گی۔ کھاتی بیٹی سوکھی جا رہی تھی۔ اور ماں باپ کو فکر پڑ گئی۔ میں بیس میل دور جا کر تھویز لے آئے، دوائیں پلاں میں مگر میرا رنگ جلا جا رہا تھا۔ اور ایک دن میں نے سنا کہ جنگلات کا سپاہی گلی میں چلتے چلتے ترپنے لگا اور لوگ اسے گھرا ٹھالائے۔ میں یہ سن کر ترپاٹھی۔

”جی چاہتا تھا کہ کسی طرح اس شخص سے راہ و رسم پیدا کروں۔ یوں اندر ہی اندر جلتے جلتے جوانی کو ہمیشہ کے لیے روگ لگا لوں گی۔ میری بھائیاں جو میری خوب صورتی کی تعریف کرتے تھکتی ہی نہ تھیں؛ مجھ سے کترانے لگیں۔ کوئی بھول کر بھی تو ادھرنہ آتی تھی۔ گاؤں میں مشہور ہو گیا کہ مجھے ”بڑی بیماری“ ہے!“

”میں ایک روز گلی میں جا رہی تھی کہ ایک بڑھیاٹی۔ میں اسے اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ ہمارے گاؤں کی پرانی بھٹیاڑن تھی جو پچاس برس تک اور دانے بھوننے کی بھٹی کے سامنے بیٹھ بیٹھ کر کوئے کی طرح سیاہ ہو گئی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”کہاں جاتی ہو بڑی اماں؟“

”کہاں جاتا ہے میٹی، بوڑھوں کا ٹھکانا ہی کہاں ہے، جہاں چھاؤں دیکھی بیٹھ گئے۔ سنا ہے تم بیمار ہو واری جاؤں آنکھوں کے گرد حلے پڑ گئے ہیں۔ یہ جوانی اور پھر یہ رنگ! اللہ رکھ تھم اتنے بڑے زمیندار کی میٹی ہو، کوئی ٹوناٹو ٹکالا و“ یوں تو یہ اندر کی بیماری بڑی خطرناک ہے۔“

”بڑھیا کی یہ بات سن کے میں گھبرائی کر اس ڈائیکن کو اندر کی بیماری کا راز کیسے معلوم ہو گیا؟“

”میں نے ذرا تھک کو پوچھا۔ ”اندر کی بیماری سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“

”بولی۔ ”یہی فکر، وہم، کوئی ایسی لمحص جود و سروں کو بتانے سے شرم آئے۔ تو یوں تو گزرنے ہو گئی میٹی، اور آؤنا۔“ یہ کہہ کر اس نے

میرا بیا زو پکڑ لیا۔

”میں نے پوچھا۔ ”کہہ رہ؟“

کہنے لگی۔ ”ادھر کسی سائے میں۔ میں تم کو دو چار باتیں سمجھانا چاہتی ہوں۔“

”میں اس کے ساتھ اس خیال سے چل پڑی کہ شاید میری بیماری کے علاج معالجہ کے متعلق کوئی مشورہ دے۔ بوڑھوں کی یہی عادت ہوتی ہے کہ بن بلاۓ مہمان بن جاتے ہیں۔

”وہ مجھے ایک غیر آبادی جگہ لے لی۔ ادھر ادھر دیکھا اور چوروں کے سے لجھ میں بولی۔ ”بیٹی تو کس خیال میں گھلی جا رہی ہے؟“

”میں نے غصے میں کہا۔ ”کیا خیال؟ تمہیں شرم نہیں آتی کہ اس قسم کی واہیات باتیں کرتی ہو!“

”اس نے یہاں یک میرے پاؤں پر اپنا ڈھیلا ڈھالا تھنڈا ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”بیٹی اس میں تیراہی بھلا ہے۔ نوجوان ہے، ابھی تیری شادی نہیں ہوئی۔ میں نے بھی یہ دن گزارے ہیں۔ ابھی ہوئے خون کی امگنیں میں جانتی ہوں جانوں رانی! میں نے اپنی جوانی کس طرح گزاری؟ وہ بیٹی تجھے کیا معلوم؟ جانے والے مر گئے۔ قیامت برستی تھی میری چال ڈھال سے۔ گاؤں کے جوان میرے قدموں تکے اپنے سر رکھ دیتے تھے۔ میرے تکوؤں سے اپنے ماتھے ملتے تھے اور تو تو ماشاء اللہ اتنی من موہنی ہے، تو کا ہے کویوں موت کے من جانے لگی؟ کسی کا نام تو لے۔ میں کان پکڑ کر اسے تیرے آگے لاؤں!“

”میں غصے میں بے کل ہو گئی۔ اس بوڑھی چڑیل کی باتیں زہر میں بجھے ہوئے تیروں کی طرح میرے دل میں گڑی چاہتی تھیں۔ میں نے کہا۔ ”بس بہت باتیں نہ بنا، میں ابھی گھر جا کر ابا کو سب کچھ بتا دوں گی اور تو میرے گھر والوں کو جانتی ہے تیری لٹکتی ہوئی کھال کھیچ لیں گے۔ میں تیری بذریعہ بدن پتویوں کی طرح نہیں ہوں کہ مردوں سے آنکھیں لڑاتی پھر دوں۔ مجھے جانے دے ورنہ تیری خیر نہیں۔“

”مگر بیٹی!“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”تم نہیں جانتیں کہ یہاں پڑوں میں ایک خوب صورت نوجوان تمہارے لیے کس قدر بے کل ہے؟“

جواب میں میں نے تیزی سے گھر کی جانب چلتے ہوئے کہا۔ ”چپ رہ، بکواس نہ کر۔“

بڑھیا نے کھانتے ہوئے صرف اتنا کہا۔ ”وہ جنگلات کا سپاہی ہے چارہ۔“

جنگلات کا سپاہی! مرے قدم رک گئے۔ مگر غور نفس! میں آگے بڑھ گئی۔ پھر بھی جی چاہتا تھا کہ واپس جا کر اس بڑھیا کو سائے

میں بھاؤں اس سے پاہی کی باتیں کروں اسے اپنا دوپٹہ اتار کر دے دوں۔ اس کے جھریلوں والے آہنوی مانچے کو چوم لوں۔ میں کتنی خوش تھی! جب میں گھر آئی تو ابا مجھے دیکھتے ہی پکارا تھے۔ ”دیکھا“ پیر حجی کی کرامت کا اثر دیکھا۔ میری جانوں کا رنگ کندن کی طرح دکھنے لگا ہے اس تھویز سے!

”میں نے دل میں کہا۔ بھولے ابا تمہیں کیا معلوم کہ میری قسمت کا پانسہ پلت گیا ہے۔ اب میں تھویز گندے کے بغیر اچھی ہو جاؤں گی! اس دن گھر کے جتنے کام میں نے کئے اور جس سلیقے سے کئے وہ تجربہ کار سے تجربہ کار عورت میں بھی اس سلیقے کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکیں۔ گھر والے بھی حیران تھے۔

لیکن پاہی میاں کی بھیجی ہوئی عورت کے رعب میں آ کر اس کے ہاں جانا مجھے منظور نہ تھا۔ یہ تو اک قسم کی بھیجی تھی؛ محتاجی، محتاجی تو ایک لعنت ہے۔ وہ خود یہاں آئے، میری ناز برداری کرے، میرے قدم چومنے تو میں اس سے بات کروں، مگر یہ تو بڑی بات ہے۔ آخر میں نے کئی دلکشی ہوئی دوپھر میں مکان کی چھت پر بیٹھ کر صرف پاہی میاں کے لیے گزار دی تھیں۔ پانچ چھ ماہ سے اپنے سینے میں ایک ایسی تپش کو پروردش دے رہی تھی جس سے میری رگ رگ میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ محبت کے آگے غرور نفس کیا شے ہے اب بڑے بڑے چوڑھریوں نے غریب غریب لاکیوں کی ایڑیاں چائی ہیں اور بڑی بڑی شہزادیوں نے مفلس دہقانوں کی ناز برداریاں کی ہیں۔ مجھے اس کے ہاں چلا جانا چاہیے مگر میں اٹھتے ہی بیٹھ جاتی تھی؛ چلتے ہی رک جاتی تھی۔ مجھے وہاں نہیں جانا چاہیے۔ نہیں جانا چاہیے۔

”اب مجھے یقین تو ہو گیا تھا کہ جس کے لیے میں اتنے عرصے سے بے تاب تھی؛ وہ خود میرے ساتھ محبت کرتا تھا۔ میں اکثر راتوں کو سوچا کرتی تھیں کہ اب اس کا کیا حال ہو گا؟ بے چارہ اکیلا بیٹھا ہو گا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہوں گے۔ سینے میں جلن ہو گی۔ جانوں جانوں زبان پر ہو گا۔ دردناک گلیاں دکھ بھرے دو ہے، دھیکی لے میں الاپ رہا ہو گا۔ بے چین ہو گا، بہت بے چین!“ ایک رات میں اپنی چار پائی سے انھی اور ماں کی چار پائی کے پاس سے آہستہ آہستہ گزرتی ہوئی باہر گلی میں آگئی۔ ایک نوجوان کنواری لڑکی اور آدمی رات کے وقت سنان گلی میں! کوئی دیکھ لے تو کیا کہے؟ گاؤں بھر میں نور دین کی لڑکی کا ڈھنڈو را پٹ جائے۔ سہیلیاں مجھ سے نفرت کریں، ماں دھنکار دے، باپ ٹھکرا دے۔ مگر آج محبت تمام مجبوریوں پر غالب آ رہی تھی۔ میں دیواروں کے ساتھ لگ کر چلتی ہوئی پاہی کے مکان کے سکھلے دروازے پر پہنچ گئی۔

اندر وہی مظہر نظر آیا جو میں اکثر اپنے تصور کی آنکھوں سے دیکھا کرتی تھی۔ وہ چار پائی پر بیٹھا تھا۔ کبھی کبھی ایک پچکی کی سی آواز

آجاتی تھی۔ اچانک وہ اخھا اور دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اب اگر بھاگتی ہوں تو یہ دیکھ لے گا، دیں کھڑی رہتی ہوں تو بھی اس کی نظر ضرور پڑے گی۔ صاف ظاہر ہو جانے سے میں نے دیوار کے ساتھ چمٹ جانے کو ترجیح دی۔ وہ باہر نکلا اور مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا جیسے روتا رہا۔ اسے کیا معلوم کہ جس کے لیے وہ آنسو بھار ہاتھا، وہ اس کے پہلو میں کھڑی ہے۔ صرف چند قدم کے فاصلے پر۔ میں نے بھی زندگی میں پہلی بار اسے اپنے اس قدر قریب سے دیکھا تھا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا، میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوئے جا رہے تھے۔ میری آنکھیں پتھرائی جا رہی تھیں۔ میں گویا دوزخ میں کھڑی ہو کر بہشت دیکھ رہی ہوں، میں گویا کائنتوں پر بیٹھی پھول سونگھ رہی ہوں۔ میرا بھی چاہتا تھا کہ اپنے محبوب کو مس کروں، اس کے گرم گرم جسم کو اپنی سرد سرد بآہوں سے چھوؤں، اسے تسلی دوں، اسے سمجھاؤں مگر مگر مجھے کسی چیز نے اندر رہی اندر روا کا۔ میرے دل میں کسی نے چکلی لی۔ میرے لیکھی کو کسی نے اپنے پنجے میں بھینچا۔ میں دیوار میں پیوسٹ ہو گئی۔

وہ جانوں جانوں کرتا ہوا جیں دلیز پر بیٹھ گیا اور پھر اچانک کانپ کر پیچھے گر گیا۔ میں بے اختیار اس کی طرف بڑھی۔ اسے چھوڑا، اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ آہت سے بلا یا مگروہ بے ہوش تھا۔ میں کھرا گئی۔ مجھے اس کے بے حس و حرکت پیکر سے خوف معلوم ہونے لگا اور پھر میں بے تحاشا اپنے گھر کی طرف بھاگ لٹھی۔ سامنے کوئی شخص آتا ہوا نظر آیا۔ میں دیوار کے ساتھ زمین پر چلتی لیٹ گئی گاؤں کا پھرہ دوار اپنی لمبی لامبی کاندھے پر دھرے کوئی گیت گئنا تھا ہوا گزر گیا۔ میں اٹھ کر پھر بھاگ لی مگر میرا دل سخت مضطرب تھا۔ پاہی بے چارہ اپنی دلیز پر بے ہوش پڑا تھا اور میں! کس قدر سفاک۔ کتنی بے غیرت اور بے شعور لڑکی تھی۔ میں نے سوچا اگر وہ ہوش میں آ جاتا اور مجھے دیکھتا تو شاید یہ خیال کرتا کہ اس کا پیار مجھے کھینچ لایا ہے۔ نہیں میں نے اچھا کیا چلی آئی۔ بہت اچھا کیا!

”مجھے اپنی محبت اور اپنے اس انوکھے غرور کا احساس تو ضرور تھا ورنہ آپ جانیں کسی کے آگے اپنے خیالات یوں کسی جاہل عورت نے بیان کئے ہیں؟ میں سوچا کرتی تھیں کہ آخر یہ دو جذبوں کے پاؤں میں کیوں پسی جا رہی ہوں؟ وہ کون سی ضروری لگتھی ہے جسے سلبھانے کے لیے خدا نے میری روح میں محبت اور نفرت کا ایک نرالا مرکب پیدا کر دیا ہے؟ سپاہی، میرا سپاہی، میرا راجہ مجھے کتنا پیار تھا۔ وہ امیں کیسے بتاؤں وہ مجھے کتنا پیار تھا؟ میں اپنی ہستی اس کی ہستی میں فنا کر دینا چاہتی تھی۔ میں اپنی روح اس کی روح میں تخلیل کر دینا چاہتی تھی۔ یوں کہ ہم ایک پیکر میں تبدیل ہو جائیں۔ ہم مجھد ہو کر رہ جائیں۔ ہمارے مجھے کو سب سے اوچی پہاڑی پر گاڑ دیا جائے۔ آنے والے نسلیں ہمیں پوچھیں۔ محبت کے فرشتے ہر صبح ہم پر بہشت کی معطراوں بر سائیں۔ مگر سپاہی جسے اس روز گاؤں کے دو آدمی ظالم سپاہی کہتے تھے۔ اندھیرے گنجان جنگلوں میں مجرموں کی تلاش میں پھرنے والا سپاہی پتھروں اور کائنتوں

سے کھیلنے والا فولادی انسان اور مجھے اتنا پیارا! میرا دل دھک سے رہ جاتا تھا۔ مجھے ان دنوں اکثر یہ خیال آتا تھا کہ میری موت دل کی حرکت بند ہو جانے سے واقع ہو گی کیونکہ اس کھینچاتانی سے میرا دل اکثر رک رک جایا کرتا تھا!

ایک روز کا ذکر ہے، میں صحیح اٹھی موسم نہایت خوبگوار تھا۔ چڑیاں فضا میں قلا باز یاں کھاتی جا رہی تھیں، چیلیں اور کوئے گھونسلوں سے نکل کر ہوا میں ایک دسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ پروں کو تول کر سوسودو دوسو گز کے فاصلے پر تیر کی طرح اپنے ساتھی پر جھپٹتے تھے اور دور ارغوانی دھنڈکوں میں غائب ہو کر پھر ظاہر ہو جاتے تھے ذیلدار کے گھر سے دھواں بل کھاتا ہوا ہزاروں نئے نئے مرغوں لے بناتا ہوا گاؤں پر بر سے ہوئے بادل کی طرح تیر رہا تھا۔ میں خوش تھی، جمیری سہلی کی شادی تھی۔ مجھے اپنا بہترین لباس پہننا تھا۔ ہاتھ پاؤں میں مہندی رچائے، ریشمی کپڑے زیب تن کیے، سونے کے لگن، سونے کے بندے، سونے کا کنٹھا، سونے کی مہر چاندی کی ہٹلی پہننے میں نے آئینہ دیکھا تو خوشی سے کانپ اٹھی۔ جی چاہا آئینے کو چوم لوں، جیب میں ڈال لوں اور گلی کوچے گھومتی پھرلوں!

”اور اس سب کچھ کے جلو میں مجھے ایک سپاہی کا متناسب جسم اس کا مسکراتا ہوا، شرماتا ہوا، چہرہ نظر آ رہا تھا، وہ ڈھیلا ڈھالا لباس۔ وہ چھوٹی چھوٹی سیاہ موچھیں، وہ سانو لا رنگ، وہ لطیف سے خم والے مردانہ ہونٹ، وہ ٹھوڑی کاخیف سا گزر ہا، وہ ماتھے کا چمکتا ہوا ابھارا، وہ آج مجھے ملے تو اسے آنکھوں کے رستے پی جاؤں لیکن لیکن!

”میں بھاگی بھاگی اپنی سہلی کے گھر گئی۔ مہمان جمع تھے، شادیا نے نج رہے تھے۔ بجے ہوئے لڑکوں اور لڑکیوں کی گھما گھمی اور پچوں کی بچ دھج دیکھنے کے قابل تھی۔ اس مجمع میں اچانک میری گردن کو کسی سخنثدے ہاتھ نے چھوا۔ میں نے مزکر کر دیکھا تو وہی بودھی کئی کھڑی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ”کیا ہے؟“

اس نے گداگروں کی سی لجاجت سے کہا۔ ”میٹی ذرا ادھر تو آؤ۔“
میں نے چڑ کر کہا۔ آ خربات کیا ہے۔“

اس نے میری طرف کچھ ایسے ملتجیانہ انداز سے دیکھا کہ مجھے اپنا سینہ چھلتا ہوا محسوس ہوا۔ میں اس کے ساتھ ہوئی۔ وہ ایک دیوار کے پاس جا کر رک گئی۔

”تو آج مجھے پر رحم کرے گی میٹی؟“

میں نے غصے سے کہا۔ ”کیا کہتی ہو، کوئی بات بھی تو کرو؟“
”لیکن وحدہ کرو۔“
”ہاں کہو۔“

”سپاہی میاں مر رہے ہیں!“
”مر رہے ہیں؟“

”ہاں مر رہے ہیں اور تمہیں ایک نظر دیکھنا چاہتے ہیں۔“
”مر رہے ہیں!“ میں ابھی اپنے حواس کو مجتمع نہ کر سکی تھی۔
”جی ہاں۔“

”میں ابھی آتی ہوں۔“
”لیکن وقت بہت کم ہے۔“
”کیا؟“

”وقت بہت کم ہے وہ جلدی ختم جو جائیں گے۔“
”ختم ہو جائیں گے؟“

”ہاں ان کی حالت سخت خراب ہے۔“

”واقعی؟“ یکا یک مجھے محسوس ہوا کہ میں پھسلی جا رہی ہوں۔ مجھے اپنی حیثیت کا خیال رکھنا چاہیے۔ آخر میں نے اپنے سینے پر پتھر کی سل رکھ کر اس بڑھیا سے صاف کہدیا کہ ”میں نہیں آ سکتی۔“

لیکن جب میں سہیلوں میں آ کر بیٹھی تو میں نے خیال کیا کہ جیسی کوئی میری پسلیوں میں ہاتھ ڈال ڈال کر میرے دل کو چھوٹا چاہتا ہے۔ کوئی میرے دماغ میں لو ہے کی گرم گرم سلاخیں پھیر رہا ہے۔ میں دیوانوں کی طرح اٹھی۔ بھاگی بھاگی گھر آئی، سب لوگ شادی پر گئے ہوئے تھے۔ ”میرا سپاہی، میرا راجہ“ کہتے ہوئے میں غیر ارادی طور پر گھر سے نکلی اور سپاہی کے گھر کی طرف بجا گئی۔ یکا یک میری ایک سکیلی نے مجھے آواز دی۔ کدھراڑی جا رہی ہو جانوں؟ ٹھہر و ذرا تو نے کچھ سنائی؟“

”سپاہی مر گیا!“

”سپاہی مر گیا!“

”مر گیا؟“ میری چینچ نکل گئی۔ بھاگی، چکر کھا کر گری اور جب اٹھی تو میں نے دیکھا لوگ سپاہی کی لاش کو اس کے گاؤں کی طرف لے جا رہے تھے۔



یہ دیا کون جلائے؟

ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور میلے کھلے دئے کی دھوآں لگتی ہوئی زبان اس طرح لرزی میسے درخت کا آخری زرد پتہ خزان کے تندر تپیڑے سے نٹ کر فضا میں کروٹیں بدلتا ہے۔ بیمار نوجوان کی بے رونق آنکھوں پر پانی کی بہمی تہہ چھا گئی۔ اس کی نگاہیں چھت پر گزری ہوئی تھیں لیکن معلوم ہوتا تھا کہ وہ تپت سے پرے کسی ایسی چیز کو دیکھ رہا ہے جسے آج تک کوئی نہیں دیکھ سکا۔ ہوا کے دوسرے جھونکے نے دئے کی لو جڑ سے اکھیز کر اندر ہیرے میں غرق کر دی اور کمرے میں کڑوے تیل کی تیز دم گھونٹنے والی بوکے سوا کچھ نہ رہا۔ بیمار نوجوان نے ایک بھی آہ بھری اور کروٹ بدلتے ہوئے نہ جانے کس سے پوچھنے لگا۔ ”اب دیا کون جلائے؟ مجھے اندر ہیرے سے دھشت ہوتی ہے۔ خانو بھی اسٹیشن پر جا کر وہیں کا ہورہا۔ اس کی ماں گاڑی سے اترتی تو سیدھی اوہر آتی۔ راہ میں اس کا کون بیٹھا تھا کہ وہاں انک جاتی!“

اس کے دماغ میں خیالات کا ایک سیلا ب امڈ پڑا۔ کلیج میں اٹھتی ہوئی پے پے ٹیسوں سے بے پرواہ کر دہ مااضی اور حال کی دھنڈلی وادیوں پر تصور کے پروں سے منڈلانے لگا۔ اس کی آنکھیں اندر ہیرے کے غیر محدود خلامیں مااضی کے مدھم مگر دلا دیر نقوش نمایاں کرنے لگیں۔ وہ سوچنے لگا۔

”اے بچپن کے دنو ابے وفا جھو! واپس آؤ۔ میں تمہیں ابھی تک نہیں بھولا۔ ابھی تک نہیں بھولا۔ میں تمہاری گود میں پلا تمہاری گود میں بڑھا لیکن تم روز بروز چیچپے بنتے گئے اور آخرتنے دور ہو گئے کہ سوائے یاد کے اور کوئی طاقت تم تک نہیں پہنچ سکتی۔ تمہارے پاس میری چند امانتیں ہیں۔ میری مخصوص خوشیاں اور میری بے پروا اور بے فکر مسکراہیں وہ واپس دے جاؤ پھر بے شک یاد سے محو ہو جاتا۔

”میں وہ لمحے نہیں بھولا جب میں چاند کو ایک گیند سمجھ کر اس پر جھپٹتا تھا اور ہوا میں بے کار ہاتھ پر مار کر تھک جاتا تھا تو اپنی ماں کی گود میں سو جاتا تھا۔ میں ایک ایسی دنیا کے خواب دیکھتا تھا جو بجائے خود ایک خواب کی طرح حسین تھی۔ میرا روحانی وطن۔ اور اس کے نقوش اب سطح تصور پر نہیں ابھر سکتے۔ میں کس قدر دور ہو گیا ہوں اس سے۔ پھر جب آنکھ کھلی تھی تو میں دیکھتا تھا کہ میرے ابا کام کر کے باہر سے آئے ہیں اور ماں کو دیکھ کر مسکرا رہے ہیں، ماں بھی مسکرا رہی ہے میں بھی مسکرا دیتا تھا۔ مجھے وہ دن بھی یاد ہیں جب میں نے

رونا شروع کیا تو بس روتا ہی رہا۔ ابا میرے سامنے ریچھ بن کر ناچے مینڈک بن کر کوئے طولی بن کر بولے شیر بن کر غرائے عجیب عجیب شکلیں بنا کیں الماری سے ایک جھنجھنا نکال لائے چادر سے چند پیسے کھول کر فرش پر لڑھکائے مگر میں روتا رہا اندر سے خوش بھی تھا پر روتا رہا۔ ان دونوں مجھے رونے اور ہٹنے میں کسی فرق کا احساس نہ تھا۔ خوش ہوتا تو روتا خفا ہوتا تو نہس دیتا۔ کسی نے تھپڑا کیا تو خوشی سے بے ڈھنگی سی تالی بجادی، کسی نے ہونٹ چوٹے تو منہ بسور کر یوں چیخا کہ ماں کی گود کے سوا اور کہیں قرار نہ ملا۔

”زینے کا اگلا درجہ چڑھتے ہی ماں کی آغوش پھیل کر ایک وسیع چار دیواری میں بدل گئی جہاں چوری چھپے سوندھی سوندھی خاک چاٹھا میرا معمول ہو گیا۔ پھر ایک دن ماں کا ہاتھ لگکن سمیت جو کان پر پڑا تو خاک پر قدم رکھنے میں بھی جھجک محسوس ہونے لگی۔ جس نے ہاتھ پھیلائے بڑھ کر اس کے گلے سے چھٹ گئے۔ روڑیاں اور لذومن بھاتا کھا جا، کڑوی چیزوں سے نفرت، اگر منہ میں بزرور کوئی دواڑاں دی گئی تو پھر حلق کو اس طرح بند کیا کہ مجبور اس بکھبھا چھوٹوں کے رستے باہر بہہ لگا۔

”آہستہ آہستہ آنکھوں سے مہین مہین پردے سرکنے لگے۔ گھر پھیل کر قصہ بن گیا۔ گاؤں کے چوکیدار کے گھر یہ ری کے درخت تلے آنکھ پھوٹی اور ”بوزھی ماں کے گھر لے جاؤ“ کے کھیل لڑکے لڑکیاں، چیخیں اور قیقہے ناج اور ناق کے ساتھ گانا۔

میرے دل دیا حرم ڈھولا

ایک دن بوزھی ماں کے گھر کا پتہ بتاتے ہوئے میں نے جو کرموں کو دھکا دیا تو بے چاری کانٹوں پر گر پڑی۔ ہتھیلیاں چھٹی ہو گئیں۔ دوسرے دن جب سب بیری تلے اکٹھے ہوئے تو کرموں کہنے لگی۔ ”اونہوں“ ہم تو نواز کے ساتھ نہیں کھلیں گے یہ تو کانٹوں پر گرا دیتا ہے۔ ”میں نے سمجھا خفا ہو گئی۔“ انکھیوں سے جو ایک دفعہ دیکھا تو دانتوں میں تنکاؤ ایسکرا ہی تھی۔ ہمت بڑھ گئی، بانہہ پکڑ کر کہا۔ ”لے پوچھ بوزھی ماں کے گھر کا پتہ۔ آج بوزھی ماں تمہیں سرسوں کے پھولوں میں ملے گی۔“ اور جب ہم سرسوں کے کھیت میں پہنچا اور میں نے اسے پھولوں پر گرا یا تو ہم اتنے ہنسنے کے پیٹ کے پٹھنے گئے اور آنکھوں سے پانی بہہ لگا۔

پھر ابادوسرے گاؤں میں چلے آئے۔ یہاں مزدوری زیادہ ملنے لگی۔

ایک دو دن تو میرا بھی نہ لگا مگر آخر کرموں جیسی میسوں لڑکیاں مل گئیں۔ کھیل کھیل کر نمبردار کے گھر کی ڈیوڑھی کا فرش خاک بنانے کا اڑا دیا۔ آخ نمبردار کی لاٹھی حرکت میں آئی اور ہم گاؤں سے باہر بھاگ لگکے۔ ہم دوڑتے جا رہے تھے کہ میرا پاؤں پھسل گیا اور گھٹنوں سے خون بہہ لگا۔ سب لڑکے اور لڑکیاں میرا مذاق اڑاتے آگے نکل گئے۔ مجھے اس وقت کرموں یاد آگئی۔ ایک دفعہ اس نے بوزھی بھٹیارن سے رور کر نسوار کی چنگلی حاصل کی تھی اور میرے ماتھے کے زخم پر چھڑ کی تھی۔

”لڑکیوں میں نہ کھیلا کرو۔“ ایک دن ماں نے کہا اور عرصے تک یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی کہ آخراں میں قباحت کوئی ہے؟ ایک دن چوپال پر گیا تو ہر طف سے کھجور اور گڑ کے تقاضے ہونے لگے۔ کہنے لگے تمہاری ملٹنی ہو گئی ہے۔ میں بجا گا بجا گا گھر آیا۔ ماں سے پوچھا۔ ”ماں میری ملٹنی کہاں کروی؟“ کہنے لگی۔ ”جس گاؤں سے ہم آئے تھے وہیں کے ایک غریب گھرانے میں۔“ میں نے سوچا ”کہیں ہو جائے کوئی مل جائے سم پوری کرنی ہے سو مجھے کیا؟“

ان دنوں میں نے عجیب عجیب پہلو بد لے۔ کبھی دو پہر کو گاؤں کی ویران گیوں میں آوارہ پھر رہا ہوں۔ کبھی پچھٹ کے کنارے شہتوں کے درخت کا سہارا لے کر گا گروں کی قل قل کے تال پر ماہیا کی کلیاں الاپ رہا ہوں۔ شادیوں میں چھٹ پر بیٹھ کر نو عمر لڑکیوں کے گیت سن رہا ہوں۔

سائیاں	والیا	جہازاں	وے
ڈھولا	سمندر	تساوے	وے

میری شادی کا دن بھی آپنچا۔ برات گاؤں میں داخل ہوئی تو مجھے چوکیدار کا گھر یاد آ گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ تو سیٹھ جو والا پر شادنے قرق کرالیا ہے اور وہاں سیٹھ جی کی آئئے کی مشین چل رہی ہے۔ ”اور چوکیدار کدھر گیا؟“ ”جیل میں“ اور کرموں؟ میں نے پوچھنا چاہا۔ میرے تصورات میں وہ ابھی تک وہی پانچ چھ سالہ لڑکی تھی جس کی ہتھیاروں میں کانٹے چھبے ہوئے تھے اور جس کے سیاہ بالوں میں سرسوں کے پیلے پیلے پھول مسکرار ہے تھے۔ مگر اب تو وہ جوان ہو گی۔ آہستہ آہستہ کرموں میرے جذبات پر چھانے لگی اور جب میرا نکاح پڑھا جا رہا تھا تو مولوی جی کی نورانی ڈاڑھی سے میری نظریں از خود ہٹیں اور کوئی تھے کی طرف اٹھ گئیں۔ شاید ان بنی ٹھنی لڑکیوں میں کرموں سمیٰ ٹیکھی ہو مگر زگاہ خود بخود ان پر سے پھلانگتی گئی اور آخر پھر مولوی جی کی لمبی ہوتی ہوئی ڈاڑھی کی طرف پلات آئی۔ مجھے آگ لگ گئی۔ میرا کا کچھ پھٹنے کی حد تک پہنچ گیا۔ میں نے چاہا کہ ایک لمبی چیخ مار کر اپنے دل کا سارا اغبار نکال دوں۔ میں کس سے پوچھوں کرموں کدھر ہے؟ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ برات کے واپس جانے کی تیاریاں ہونے لگیں، پر میرے دل پر ایک بار سا پڑ گیا تھا۔ گھر پہنچنے شام ہوئی، وہیں کو دیکھا تو دماغ نے اپنا کام کرنا چھوڑ دیا! زمین قلابازیاں کھاتی ہوئی معلوم ہوئی! ہر ساکن چیز متحرک ہو گئی! میرے سامنے کرموں ٹیکھی تھی!

”کرموں تم؟“

”تم؟ نواز؟“

”مجھے خیال ہی نہ تھا۔“

”اور مجھے کب خیال تھا۔“

”کرموں!“

”نواز!“

اس کے بعد میں اسے لے کر اس شہر میں آگیا کہ اپنا اور اپنی کرموں کا پیٹ پالوں۔ باپ بوڑھا ہو گیا تھا اور ماں شادی کے بعد ہی ہیسٹے کی وبا کا شکار ہو گئی تھی، سو مجھے بھی با تھجھیر ہلانے کی ضرورت محسوس ہونے لگی! یہاں خانو پیدا ہوا۔ دن مزے سے کئے گے۔ بھوکے بھی سوتے تو پروانیں ہوتی تھیں۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر سیر ہو جاتے تھے۔ نہ گلے نہ شکوئے وہ مجھے سے خوش میں اس سے خوش۔ اس سے برتن نوٹا میں نے کہا۔ ”میں اور لے آؤں گا۔“ میں دیر سے آیا تو اس نے کہا۔ ”دیر ہو ہی جایا کرتی ہے۔“ خانو ہمارا تھا منا سرمایہ! اس کی تولی باتیں! ”ابا میلی ماں لوٹی پکلتی ہے۔“ ”ابا آج میلا پنگ کت گیا مجھے بہت شلم آئی!“

اب دس دن ہوئے کرموں و وہنتوں کے لیے میکے گئی ہے۔ اسی دن شام کو مجھے زکام اور بخار نے آن دبوچا۔ رات کو دمیں پہلو میں درد ہونے لگا۔ مزدور بھائیوں نے کہا کہ نہ موئی ہے۔ تین دن چار پائی پر مل کھاتے گزرے۔ پنگ آ کر کرس و کو خطا لکھوا یا کہ جلدی آؤ۔ آج اسے آتا ہے۔ کرموں کے سوا میری دیکھ بھال کون کر سکتا ہے؟ کرموں سامنے آئے تو سارے دکھ کا فور ہو جائیں۔ اب وہ خدا کرے آجائے۔ مگر آئے گی کیسے؟ گاڑی کا وقت تو کب کا گزر چکا۔ اور وہ خانو کدھر گم ہو گیا اندھیرے میں رستہ نہ بھول گیا ہو بے چارہ۔ اللہ مجھے تو اس اندھیرے سے وحشت ہوتی ہے۔ یہ دیا کون جلائے؟

ہوا کا ایک اور جھونکا آیا۔ یہاں نواز کے پہلو سے ٹیکوں کا طوفان اٹھا اور وہ چار پائی پر سمت کر گھٹھری بن گیا۔ وہ پکارا تھا۔ ”ہائے میرے اللہ خانو اوارے خانو اون خانو بیٹا۔“

”جی ابا“ دیر سے آواز آئی۔ ”اماں بھی آ رہی ہیں۔“

کمرے کا دروازہ دھک سے کھلا۔ ”ہائیں!“ خانو پکارا۔ ”دیا تو بجھ گیا، اب اسے کون جلائے؟“ ”میں جلاتی ہوں، تم ابا کو پکارو۔“ کرموں نے بے حد تیزی اور بے تابی سے کہا۔

”ابا!“ چھر کی آواز آئی۔ دیا جل اٹھا! کرموں بانیں پھیلائے یہاں رخاوند کی طرف بھاگی۔ ”میرے ماں!“ اس نے اس کے ماتھے پر باتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"اہا!" خانوچنی اٹھا

بیمار نواز چھت سے پرے کی ایسی چیز کو دیکھ رہا تھا جسے آج تک کوئی نہیں دیکھ سکا۔ کرمون لڑکھڑا کر چیچپے گر گئی۔ خانوچنی انہوں مال کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بملکتی ہوئی اٹھی اور بچے کی پھٹی پھٹی آنکھوں کو چوم کر بولی۔ "میرے لال! اب یہ دیا کون جلائے؟" دیے کی اوپھر اٹھی!



بے چارہ

بے چارہ بیگار میں پکڑا گیا تھا۔ ذیلدار کی حکم عدوی کیسے کرتا۔ گاؤں کو چھوڑ کر اور کہیں جا بنا اس کے بس کی بات نہ تھی ورنہ روز روز کی بیگار سے اس کی زندگی اجیرن ہو رہی تھی۔ سب ڈویژنل افسر کا دورہ تمام علاقے میں تھا اور اسے مرغوب کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ وہ سر پر ایک بڑا سانوں کر کر کھے کوئی دیہاتی راگ گنتگنا تاتا جا رہا تھا۔ مرغ نو کرے میں چیز رہے تھے۔ دو ایک کی گرد نیس نو کرے کے منہ پر بندھی جائی میں پھنسی ہوئی تھیں اور وہ گول گول، نخنی نخنی آنکھوں سے نیلے آسمان کو گھوڑہ ہے تھے۔ اس اپنے گاؤں سے پانچ میل کے فاصلے پر جانا تھا۔ دلکشا بلند یاں گھومتی ہوئی پگنڈنڈ یاں گول سفید پتھروں سے پٹے ہوئے ڈھلوان رستے، گہری گھائیاں، گھائیوں کے دہانوں پر سبز گنجان جھاڑیوں کے جھرمٹ چڑیوں کی قطار میں چیلوں کے غول لکھرے ہوئے کھیتوں میں بیرون کی روح نوازتا نہیں۔ نخنی لاڑکیوں کے کاندھوں پر اپہراتی ہوئی میلی زلفیں، دوشیزاءوں کے گلابی چہرے، گرو غبار سے اٹے ہوئے ہاتھ۔ دہقانوں کی چوڑی ابھری ہوئی پیشانیوں پر خاک کی تہیں۔ وہ ہر روز انہیں دیکھا کرتا تھا، لیکن آج آج خدا جانے اس کے نظریہ میں اتنی تبدیلی کیوں واقع ہو گئی تھی۔ اسے ہر چیز میں ایک بے نام سے کشش کا رفرمانظر آتی تھی۔ یہ گول گول، نخنے نخنے پتھر! وہ چاہتا تھا ان پر لیٹ کر کروٹیں بدلتے ان پر کو دے ناچے! اور گھائیاں! ان میں اتر کروہ ماہیا کی دردناک دلکھ بھری "کلیاں" گائے اور پھر وہ دوشیزائیں! آغاز جوانی کے مجسمے! ان کوتازیست دیکھا کرے نیلا لکھر لکھر آسمان! اسے اچک کر چوم لے وہ بیگار میں پکڑا گیا تھا، مگر پھر بھی وہ خوش تھا۔ اور کس لیے؟ آج صبح اسے پڑوں کی وہی لڑکی ملی تھی جسے دیکھنے سے اس کا جی کبھی نہیں بھرتا تھا اور اس لڑکی نے اس سے کہا تھا۔ اپنی آنکھیں جھکا کر "آج شام کو مجھے سیاہ چٹان کے پاس مانا!"

"بچتا بھائی!" کسی نے آواز دی اور وہ رک گیا۔ ایک دہقان اک مضبوط نیل پر بھو سے کاپورا لادے کھڑا تھا۔ وہ نو کرے کو سنبھالتے ہوئے ایک طرف ہو گیا۔

"کہاں جاؤ گے؟" نیل والے نے نیل کو ہاتھتے ہوئے کہا۔

"مزال بگل میں حصہ ضلع آیا ہے؛ ذیلدار نے مرغ بھجوائے ہیں۔"

"کسی میراثی کو کہہ دیا ہوتا۔" نیل والے نے نیل کو ہاتھتے ہوئے کہا۔

”سب کسی نہ کسی کام پر باہر گئے ہوئے تھے۔ صحیح ذیلدار کی نظر میں مجھ پر ہی پڑیں۔ کیا ہوا بھائی ٹانگمیں سیدھی کروں گا۔“
بیٹھے بیٹھے جی اکتا گیا تھا۔“

”اچھا سلام الکرم۔“

”والکرم سلام۔“ اس نے الفاظ کو کھینچتے ہوئے جواب دیا۔ وہ اس شخص سے اور بھی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ ٹانگمیں باتیں۔ جوانی کی ان پھولوں سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں کی۔ ان کھینتوں میں دوڑنے والی دوشیزراویں کی، مگر وہ دور جا چکا تھا۔ آج شام کا وقت اور وہ سیاہ چٹان اور اشام کو وہ پتھر میں خشک گھاٹی ایک جنت بن جائے گی جنت!

ایک مرغ اجاتی کو پھاڑ کر باہر آن گرا۔ بے چارے کی ٹانگمیں تو بندھی ہوئی تھیں، لڑک کر ایک جھاڑی میں انک گیا۔ اس نے تو کراز میں پر رکھ کر اپنی گزدی پھینی ہوئی جگہ پر دھردی۔ مسکراتا ہوا مغرو مرغ نے کے پاس پہنچا۔ اس کے پھر پھر اتے ہوئے پروں کو ہاتھ میں لیا اور اس کی گردان پر دو ایک دفعہ انگلیاں ماریں۔ جیسے اس کے کئے کی سزادے رہا ہے اسے تو کرے میں بند کر دیا۔ جاتی کی مرمت کی اور چل پڑا۔

”بیچو گے بھائی! یہ مرغے بیچو گے؟“ ایک معترض صورت بزرگ نے اس سے پوچھا۔

”نہیں جی!“

”لے جا کہاں رہے ہو؟“

”پرسوں تھانیدار صاحب گاؤں کے سب مرغے اڑا گئے۔ اب حصہ ضلع کا فرمان آیا ہے کہ مرغے بھجواؤ۔“
اور وہ بزرگ بڑ بڑا تھا ہوا ایک طرف چل دیا۔

وہ حیران تھا کہ حصہ ضلع کا پیٹ اتنے مرغے کھا کر پھٹ کیوں نہیں جاتا؟ مرغے کا گوشت تو گرم ہوتا ہے! اس کا دماغ نہیں چکراتا؟ کہیں اسے دورے میں یرقان کی شکایت نہ ہو جائے! یہاں نہ ہو جائے وہ! اتنے مرغے اسے کیا معلوم کہ حصہ ضلع کے چیلے چانے بکروں کو نگل جاتے ہیں، مرغے تو پھر مرغے ہیں!

سامنے اسے ایک کٹواں نظر آیا۔ دس گیارہ سال کی ایک لڑکی اکملی بیٹھی رورتی تھی۔

”یہ روکیوں رہتی ہے؟ دنیا آج اتنی خوش ہے۔ سنواراتنا مسرو۔ اور یہ رو رہتی ہے!“ اس نے سوچا۔

وہ اس کے پاس پہنچا۔ بے چاری کا ڈول کنوئیں میں گر گیا تھا۔ اس نے ڈول کی رہی پاس کے درخت سے باندھی اور نیچے کنوئیں

میں اتر گیا۔ پہاڑی کنوں میں۔ گھرے اور تاریک غار مگر ری بھی مضبوط تھی اور وہ خود سپلے کئی بار کنوں میں اتر چکا تھا۔ وہ ڈول ٹکال کر اوپر چڑھ آیا۔ لڑکی خوش ہو گئی اور آنسوؤں سے بھیگے ہوئے رخساروں پر ہاتھ پھیر کر مسکرا نے لگی۔ وہ بھی بہت خوش ہوا اور توکر اٹھا کر آگے چل دیا۔

دور چوٹی پر ایک چڑواہا اپنی بکریوں کا دودھ دوہ رہا تھا۔ ایک بوڑھی عورت کھیتوں کی مینڈھوں پر بیٹھی جنگلی ساگ توڑ رہی تھی۔ مزال کی جھیل سورج کی کرنوں کی وجہ سے خود کرنوں سے زیادہ چکر رہی تھی وہ چلتا گیا! خوش اور مست! اور آخر سے سرکاری بلگل نظر آیا۔ دو پہر کا وقت تھا۔ اس نے سوچا وہ ابھی تو کروائے کرواپس آجائے گا اور شام کو اس سیاہ چٹان کے پاس اگر دنیا اتنی اچھی ہے تو جنت کا تصور ہی محال ہے!

بلگلہ قریب تھا۔ بلگلے کے باہر کئی دہقان بیٹھے تھے۔ برآمدے میں سرخ کنوں اور سنہری بیٹھیوں والے بوڑھے اردوی اس طرح چکر کاٹ رہے تھے جیسے متعفن لاشوں پر گدھ منڈلاتے ہیں۔ دوٹی ناک کے سرے پر یعنک دھرے کچھ لکھ رہے تھے۔ ایک اردوی نے اسے دیکھ لیا اور پچڑی کوٹھیک کرتا ہوا چلن اٹھا کر بلگلے کے اندر چلا گیا۔ وہ برآمدے کے قریب پہنچا۔ سفید سرخ رنگ کے موٹے سے ایک صاحب سگار کے کش لگاتے باہر نکلے۔

”کس نے بھیجے ہیں؟“

اس نے تو کراز میں پر رکھ دیا اور سلام کیا۔ وہ بہت خوش ہوا۔ حصہ ضلع ایک غریب دہقان سے باتمیں کر رہا تھا۔ کتنی عجیب بات تھی! ایسے لوگ تو ذیلدار، نمبرداروں، تحصیلداروں اور تحائفداروں سے باتمیں کرتے ہیں۔ وہ اور خوش ہو گیا۔ ”چودھری جان محمد نے جی۔“

”اچھا، یہ یہاں رکھ دو اور سکیسر کی چوٹی پر یہ رقصہ بڑے صاحب کو جا کر دے دو۔ وہ تمہیں جو جواب دیں گے وہ واپس یہاں دے جانا، سمجھے؟“

اس کا سر چکر اگیا۔ غیر ارادی طور پر اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اس کا خون نہ جانے کیوں رک گیا تھا۔ اس کی کپٹیاں اور آنکھیں نہ جانے کیوں جلا گئی تھیں! حصہ ضلع نے اسے ایک لفافہ پکڑا دیا۔ اس نے اسے پکڑی کے ایک سرے میں باندھا۔ سلام کیا اور بلگلے کا چکر کاٹ کر سڑک پر آ پہنچا۔ دور سکیسر کی چوٹی آسمان سے باتمیں کر رہی تھی۔ کتنا دوڑ رہے سکیسر! چار میل اس کے دامن تک اور پھر بارہ تیرہ میل اس کی چوٹی تک۔ شام نہ ہو جائے۔ اور وہ سیاہ چٹان!

گا! بے رحمِ ضلع! ظالم!

اس نے تہ بند کو مضمبوط سے باندھا، جوتے ہاتھ میں لیے۔ خدا کا نام لے کر بھاگنا شروع کر دیا۔ کیا ریوں میں کام کرنے والی لڑکیاں اسے دیکھ رہی تھیں اور وہ رستے کی سنگریوں کو اڑاتا ہوا پکا جا رہا تھا۔ سکیر کی چونی اسے اور دوسرے حکمتی ہوتی تھی مگر وہ بھاگتا اور آخر کار سکیر کے دامن میں پہنچ گیا مگراب وہ تحکم چکا تھا۔ چار میل ایسے پتھر میلے علاقے میں اپنی پوری طاقت سے دوڑتا دشواری بات ہے اور پھر وہ اونچی عمودی سڑک۔ تیرہ میل! اف، شام ہو جائے گی اور پھر اس چٹان کے پاس کوئی آ کر واپس چلا جائے گا!

کائنات کی ہر چیز اسے مغموم نظر آنے لگی۔ اس نے ایک لمبی سانس لی اور دانت پیس کر اور پڑھنا شروع کر دیا۔ کہیں دوڑتا کہیں چلتا اور آخروہ بالکل تحکم گیا۔ پیاس سے اس کا گا جلنے لگا۔ وہ لفافا سے اس نوکرے سے بھی بھاری معلوم ہو رہا تھا اور پھر دس میل اور..... سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ شام ابھی ابھی ہو جائے گی اور وہ سیاہ چٹان! کاش! ایک لمحے کے لیے اچھا خدا اسے پر دے دیتا۔ مگر اس نے اپنے بھاری پاؤں اوپر اٹھانے شروع کئے۔ رستے کے ہر پتھر میں اسے اپنے گاؤں کا نقشہ نظر آتا تھا۔ اور پھر وہ تنگ گلی! وہ لڑکی جسے دیکھنے سے جی نہیں بھرتا تھا اور وہ زخمی سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا رستے اور وہ سیاہ چٹان! شام کی وہندلائیں!“

وہ بھاگنے لگا۔ دو ایک جگہ اصل رستہ چھوڑ کر جھاڑیوں اور چٹانوں سے لٹک کر تیزی سے نیچے اترًا مگراب اس کے حواسِ معطل ہو رہے تھے۔ ایک پتھر پر بینچ کر سر دیا۔ یہ افسر لوگ بھی لکنے ظالم ہوتے ہیں۔ وہ سورج رہا تھا! انہیں کبھی خود غرض انسان! منتظر ریا کار لوگ! اور اب سورج اسے نظر نہ آتا تھا لیکن نیچے کھیتوں پر اس کی زرد شعاعیں کھیل رہی تھیں۔ مشرق کی طرف دور اسے اپنا گاؤں نظر آیا۔ اور وہ سیاہ چٹان مگریے گاؤں دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ اور پڑھتا گیا۔

اور آخر سے ایک بیگنے نظر آیا۔ بیگنے کے باہر ایک صاحب تین خوش پوش نوجوانوں کے ساتھ ٹھیل رہے تھے۔ وہ بھاگا بھاگا ان کے پاس پہنچا۔ اوہ سورج نے مغربی افق کو چوہماً اور اس نے رقد صاحب کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ سورج رہا تھا کہ اگر اب بھی وہ کوشش کرے تو آدمی رات کو اس سیاہ چٹان کے پاس پہنچ جائے گا اور وہ لڑکی اس کا انتظار کرے گی۔ ضرور کرے گی
”یدِ قدر بڑے صاحب کا ہے ہمارا نہیں اس بیگنے میں جاؤ۔“

صاحب سے رقص لے کر پھر گزری میں رکھا اور بھاگا۔ چاروں مہذب نوجوان قبیقے لگانے لگے مگر وہ بھاگتا ہی گیا۔ اور آخر وہ بڑے صاحب کے بیگنے کے قریب جا پہنچا۔ بڑے صاحب ایک کتے کے سر پر رہا تھے پھیر رہے تھے۔ اس نے سلام کر

کے رقعہ انہیں دے دیا۔ سلام کا جواب دیئے بغیر صاحب نے رقعہ کھولا اور مُنشی کو آواز دی۔

”اس شفقت کو ایک رقعہ لکھ دؤ موسیٰ خلیل سے پکھھ مرغے لے آئے گا۔ یہاں سے موسیٰ خلیل کتنی دور ہے؟“

”میں میں حضور!“ مُنشی نے ایک کمرے سے بھاگ کر نکلتے ہوئے اور کوٹ کے بہن بے ترتیبی سے اپر نیچے چڑھاتے ہوئے جواب دیا۔

”خیر صحیح تک واپس آجائے گا۔“

بے چارے نے بڑے صاحب کی طرف اس طرح دیکھا جیسے اسے کھا جائے گا۔ مُنشی کی طرف دیکھا جیسے اسے نگل جائے گا، چبا جائے گا۔

مُنشی کے ہاتھ سے رقعہ لے کر گڈوی کے ایک سرے میں باندھا۔ شفقت سے دھوئی ہوئی واڈی کے اس پارا سے اپنے گاؤں کے دھنڈے دھنڈے نتوش نظر آ رہے تھے اور پھر وہ پڑوں کی لڑکی ہے دیکھنے سے جی نہیں بھرتا تھا۔ وہ سیاہ چٹان جس کے پاس اس وقت وہ لڑکی بیٹھی ہو گی۔ اس کامنہ کھلا ہو گا۔ اس کی آنکھیں منتظر ہوں گی۔ اس کے بال منتشر ہوں گے اور اس کے گلابی رخساروں کی چک ماند پڑ رہی ہو گی۔ میرے خدا!

اس نے پکلوں پر لرزے ہوئے دو موئے آنسوؤں کو پوچھا اور سر جھکائے موسیٰ خلیل کی طرف چل پڑا۔ بے چارہ!

